ماہ نامہ ماہِ نور دہلی

حسب فرمائش

Choksi Brothers & Sisters
چوکسی برادرس اینڈ سسٹرس

نوٹ: رسالے کے مستقل قارئین اس جانب ضرور توجہ دیں کہ اگر ان کی ممبری فیس ختم ہوگئی ہو تو ادارہ کو جلد از جلد بذریعہ منی آرڈر روانہ کردیں تا کہ ان کی ممبری بحال رہے۔

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ

ماہ نامہ ماہِ نور
419، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی-110006

MAAH-E-NOOR Monthly
419, Urdu Bazar, Matia Mahal,
Jama Masjid, Delhi - 110006

E-mail:mahenoormonthly@gmail.com, Website : www.abulghaus.com

قیمت فی شمارہ	:	12روپے
قیمت سالانہ	:	150روپے
بیرونِ ممالک	:	20ڈالر
لائف ٹائم ممبر شپ	:	5000روپے
// // بیرون ممالک	:	300ڈالر

Printer, Publisher & Owner
SYED ABUL HASAN

Published at:
2229, Star Offset Printing Press
Ahata Hajjan Bi, Rodgran, Delhi-6

Published from:
419, Urdu Bazar, Matia Mahal,
Jama Masjid, Delhi - 110006

نوٹ: ● رسالے سے متعلق کوئی بھی مقدمہ صرف دہلی کی عدالت میں قابل سماعت ہوگا۔ ● مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں (ادارہ)

فہرست مضامین

خصوصی موضوع:
بدعت: تفہیم و تجزیہ

نوشاد عالم چشتی(علیگ)

برطانوی ہند میں آریہ سماجی مسلم مناظرے: ایک مختصر جائزہ!

زمانہ قدیم سے برصغیر (ہندو پاک و بنگلہ دیش) مختلف خیال اقوام، ذات پات، رنگ و نسل، تہذیب وثقافت پر مبنی سماج کا گہوارہ رہا ہے۔ اسی لیے کثرت میں وحدت ہندوستانی سماج کی بنیادی خوبی تسلیم کی جاتی ہے۔ آرین، ہوڑ، شک، کوشاڑ، بختری، یوا ے چی، جاٹ اور گوجر سے لے کر مسلمانوں تک جو اس ملک میں مختلف دور میں مختلف حیثیت سے آئے۔ سب نے ہندوستان کو اپنا حقیقی وطن بنالیا۔ اگر چہ ان اقوام میں کبھی کبھی تصادم وتنافر کا ماحول بھی پیدا ہوا مگر جلد ہی افہام وتفہیم کی بنیاد پر احترام باہمی کے ساتھ ہر سماج و دین و مذہب اور فرقے کے افراد نے ایک ساتھ رہنا سیکھ لیا۔ بقائے باہمی کے ساتھ آپسی رواداری کا یہ جذبہ وقت اور حالات کے ساتھ بہتر سے بہتر ہوتا چلا گیا اور اسی ماحول نے گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے میں بہت نمایاں کردار نبھایا۔ برصغیر میں امن واتحاد کا یہ دور کافی طویل عرصے تک برقرار رہا۔ ہر دور کے تمام سربراہانِ حکومت نے اپنے اپنے عہد میں اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا ہر ممکن خیال رکھا۔ کسی بھی فرقے کے متعلق ہر طرح کی اشتعال انگیزی حکومتِ وقت کی جانب سے ممنوع قرار دی گئی۔ آپسی بھائی چارگی اور جذبۂ احترام انسانیت کے فروغ میں صوفی سنتوں نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ مختلف تہذیب وثقافت کی آپسی لین دین نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو خوب خوب فروغ دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بھی انگریزوں کے خلاف ہندو مسلم اتحاد ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اکثر و بیشتر دستاویزی شہادتیں اس موضوع کے حوالے سے محبِّ وطن مؤرخین نے فراہم کردی ہیں جنھیں کسی مصلحت کے تحت متعصب ذہن کے قلم کار اب تک ہندوستانی عوام کے سامنے نہیں لاسکے تھے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی ہر دَور میں ہمارے ملک کی اشد ضرورت رہی ہے۔ کیوں کہ اسی میں تمام ہندوستانی قوم کی بھلائی، ترقی اور خوش حالی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے سے پہلے ہندو مسلم اور ہندوستان کی دیگر قومیں آپس میں مل جل کر ایک طویل عرصے سے رہتی چلی آرہی تھیں۔ مگر فرنگی قبضے کے بعد انگریزوں نے 'پھوٹ ڈالو اور ان پر حکومت کرو' کی پالیسی کو اپناتے ہوئے ہندوستانی عوام کو سیاسی وسماجی، تہذیبی وثقافتی، مذہبی اور لسانی تصادم میں مبتلا کردیا۔ اس طرح مختلف مذاہب کے پیروکاروں اور ذات برادری کے درمیان بحث ومباحثہ اور مناظرے کی بنیاد پر مخاصمت ومخالفت کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے اثر سے تمام ہندوستانی عوام جو استعماری حکومت سے قبل آپسی بھائی چارگی کے ساتھ سماج میں ایک ساتھ رہنے کے عادی ہو گئے تھے اب وہ برطانوی راج میں ۱۸۵۷ء کے کچھ ہی عرصے کے بعد نہ صرف ایک دوسرے کے دشمن بلکہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے۔ بطور خاص آریہ سماجی ہندو مسلم مناظرے اور اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادتو پورے ملک کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ اس طرح سے فرقہ واریت نے ہماری قومی یکجہتی کو نہ صرف ختم کیا بلکہ تقسیم ہند کے دل خراش حادثات سے بھی ہندوستانی عوام کو دو چار کیا۔ انگریزوں کے خلاف جب پورے ہندوستانیوں کو متحد ہو کر لڑنا چاہیے تھا، اُس وقت ہم ہندوستانی لوگ مناظرے، مجادلے اور مباحثے کے ذریعے آپس ہی میں دست وگریباں کیوں ہوگئے؟ یوں ہی ہندو مسلم اتحاد کو صدمہ پہنچانے میں آریہ سماج نے کیا کردار ادا کیا؟ اس اہم قضیے کے متعلق تاریخی شواہد اور آثار ودستاویزات ہمیں کیا ثبوت فراہم کرتے ہیں ان کا منصفانہ جائزہ لینے کی اشد ضرورت ہے۔

وائس رائے ہند لارڈ ڈفرن کے ایما پر ایک انگریز مسٹر ہیوم نے 'انڈین نیشنل کانگریس' کو ۱۸۸۵ء میں قائم کیا، مگر قیامِ کانگریس سے ۱۰ سال قبل آریہ سماج کا قیام ۱۰/اپریل ۱۸۷۵ء کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے تقریباً ۱۸ سال بعد بمبئی میں ہوا، لیکن لاہور پنجاب میں آریہ سماج کے شاخ کو بمبئی سے دو سال بعد ۲۴/جون ۱۸۷۷ء سے قائم کیا گیا، مگر اس تحریک کے بانی سوامی دیانند سرسوتی نے آریہ سماج تنظیم کے باقاعدہ قیام سے تقریباً ۶ سال پہلے ۱۷/نومبر ۱۸۶۹ء کو بنارس میں درگا کنڈ کے نزدیک آنند باغ میں سناتن دھرم کے مشہور رہنما پنڈت وی شودھانند پال شاستری سے پبلک میں مناظرہ کر کے نہ صرف سناتن دھرم سماج (بنارس) میں بلکہ ہندوستان کے تمام مذہبی سماج میں ہلچل مچادی۔ اور اس کے بعد تو آریہ سماج کے مناظروں نے مختلف دین و مذاہب اور فرقے کے عالموں کو للکار للکار کر ہندوستانی سماج میں فرقہ واریت کا زہر گھول دیا۔ ۱۸۸۷ء میں بمبئی میں، ۱۸۸۸ء میں فیروزآباد میں، ۱۸۹۰ء میں خورجہ میں، ۱۸۹۲ء میں وشنوگڑھ (ضلع فرخ آباد) میں، ۱۸۹۳ء میں کیرانہ (ضلع مظفر نگر) میں، ۱۸۹۵ء میں نی مچ (راجستھان) میں، ۱۸۹۶ء میں وزیرآباد (ضلع گوجرانوالہ موجودہ پاکستان) اور چندوسی مرادآباد میں، ۱۸۹۸ء میں فیروزآباد میں، ۱۹۱۷ء میں دلی میں، ۱۹۱۸ء میں ویلم ضلع مظفر نگر اور خورجہ میں، ۱۹۲۳ء ۱۹۱۴ء میں، بریلی میں، ۱۹۲۳ء میں فیروز پور پنجاب میں ۱۹۲۹ء میں، شاہ پور اور سیمان گڑھ (راجستھان) میں ۱۹۳۳ء میں چندوسی میں اور اس کے علاوہ بھی ملک کے مختلف مقامات پر ہوئے آریہ سماجی مناظروں نے تو قومی یکجہتی کو نقصان پہنچانے میں بڑا بھیانک کردار ادا کیا۔

سوامی دیانند سرسوتی کے علاوہ آریہ سماجی مناظروں میں اسلام کے خلاف مسلمانوں سے مناظرہ کرنے والوں میں پنڈت مراری لال شرما، سوامی درشنانند، پنڈت لیکھ رام آریہ، پنڈت رام چند دہلوی، پنڈت بھوج دت آریہ، پنڈت شیو شرما، پنڈت کالی چرن، مولوی فاضل، ٹھاکر امر سنگھ، پنڈت دھرم بھیک چھو، شانتی سروپ قریشی، پنڈت رودر دت، پنڈت بہاری لال شاستری، پنڈت شیر سنگھ، پنڈت سردھانند وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

اسلام کی حمایت میں مناظرہ کرنے والوں میں خواجہ حسن نظامی، صدرالافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مولانا سیّد احمد سعید کاظمی، مولانا حشمت علی خاں پیلی بھیتی، مولانا سید غلام قطب الدین برہم چاری، مولانا محمد غلام دستگیر قصوری، مولانا عبدالحمید پانی پاتی، مولانا ابورحمت حسن قادری، مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا غلام الحسنین پانی پتی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، غازی محمود، دھرم پال، بابا خلیل داس (بنارسی) اور مرزا غلام احمد قادیانی وغیرہ وغیرہ کے علاوہ لیڈی ڈاکٹر حلیمہ خانم کا کارنامہ قابلِ ذکر ہے۔ واضح ہو کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی اسی مناظرانہ شہرت کے بعد اپنی دعاوی کے مختلف مراحل کو طے کرنا شروع کیا۔

مناظرہ بازی کے علاوہ آریہ سماج نے شدھی سنگٹھن تحریک (قیام ۱۳ر فروی ۱۹۲۳ء) کے ذریعے جس طرح مسلم دل آزاری کی شروعات کی اور پھر مسلم ردِّ عمل میں جواب اور جواب الجواب کا جو پرتشدد سلسلہ شروع ہوا تو قتل وخون کا بازار گرم ہوگیا۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو مشہور آریہ سماجی مناظر شردھانند کا قتل ہوا۔ یہ وہی شردھانند ہیں جنھیں تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) کے دوران شاہی جامع مسجد دہلی کے ممبر پر خطاب کرنے کا مسلمانوں نے غیر معمولی شرف بخشا تھا، مگر موصوف نے اسلام، پیغمبرِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے اور ان کی دل آزاری میں مسلمانوں کے اس احسان کا ذرّہ برابر بھی پاس نہیں رکھا۔ پیغمبرِ اسلام کے خلاف 'رنگیلا رسول' نامی کتاب موصوف ہی کی ذہنی اختراع تھی۔

پھر اس کے بعد بدری پرشاد، بھیروں سنگھ، بہادر سنگھ، بنواری لال، سیتانند اور راج پال وغیرہ اپنی پرتشددانہ اور گستاخانہ حرکات کی بنا پہ مارے گئے، ان گستاخوں کو قتل کرنے والوں میں علیم الدین، عبدالرشید، عبدالقیوم، عبداللہ اور امیر احمد کا نام نمایاں ہے۔ انگریزی حکومت نے انھیں پھانسی دی اور مسلمانوں نے انھیں 'غازی' کے لقب سے نوازا۔ جبکہ آریہ سماجیوں نے اپنے مقتولوں کو 'بلیدانی' کا خطاب دیا اور مسلمانوں کو 'ملیچھ' کہا۔ آریہ سماجیوں کے ذریعے پیدا شدہ اس دہشت گردانہ ماحول میں ہوئے قتل و پھانسی کے ان تمام معاملات نے ہندو مسلم منافرت کو بڑھانے اور فرقہ وارانہ فساد برپا کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ ان عوامل سے دو قومی نظریے کی بنیاد کو ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کو تقویت ملی۔ اور قیام کانگریس کے ۲۱ سال بعد ۱۹۰۶ء میں قائم مسلم لیگ کے قائدین اسی بھیانک پس منظر میں اپنی قوم کی بقا کے لیے ایک نئے رُخ سے غور وفکر کرنا شروع کیا۔ نتیجتاً تقسیم ملک کا حادثہ پیش آیا۔ فرنگیوں نے ہندوستانی قومی یکجہتی کو نقصان پہنچانے میں کس طرح کی سازش کی اور سازشوں کو کامیاب بنانے میں کیسے کیسے ہندوستانی افراد یا تنظیم و جماعت یا مخصوص مسلک وفرقے کو اپنا آلۂ کار بنایا اور کس کس طرح اپنے مقاصد کی تکمیل میں انھیں استعمال کیا۔ یہ وہ اہم سوالات ہیں جو تاریخ کے طالب علم کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہیں۔

برطانوی راج میں فرنگیوں نے ہندوستانی سماج میں جس فرقہ واریت کی آبیاری کی تھی تقسیم ہند کے بعد بھی ہمارا ملک اس فرقہ واریت کے مہلک اثر سے جاں بر نہیں ہوسکا ہے۔ ماضی کی غلطیاں آج کے موجودہ دور کی نسلوں کے لیے ناسور بن گئی ہیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں روز بروز مختلف طبقوں کی جانب سے ہو رہی دہشت گردانہ کارروائیوں کا سلسلہ کہیں استعماری دور کے فرقہ وارانہ تصادم کی جڑوں سے تو نہیں ملتا، اس جانب بھی ہماری توجہ جانی چاہیے اور اس پر غیر جانب دارانہ تحقیقی کام بھی ہونا چاہیے۔

برطانوی راج میں فرقہ واریت کو ہندوستانی معاشرہ میں بہت بڑھاوا ملا اس کے متعلق کئی تحقیقی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ڈی واڈلے کی انگریزی میں تحریر شدہ کتاب 'The Arya Samaj, Hinud Without Hinduism' میں مصنف نے جارحیت پر مبنی ہندوازم کی نشر واشاعت کے متعلق آریہ سماجی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے، ان کے طرزِ عمل، نقل وحرکت اور حکمتِ عملی کو بھی بیان کیا ہے۔ ایک دوسری انگریزی کتاب ایس. اے. ڈبلو جانس کی 'Communalism in the Punjab, the Arya Samaj Contribution' کے نام سے منظرِ عام آئی ہے۔ وہ اس حوالے سے لائق مطالعہ ہے، مگر مصنف نے اس کتاب میں اپنی پوری توجہ صوبہ پنجاب کے فرقہ واریت پر ہی مرکوز رکھا ہے۔ ایک اور کتاب جے. ای. للّی، ویلن کی 'The Arya Samaj as a Fundamentalist Movement' کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے اس کتاب میں مصنف نے فرقہ واریت کے فروغ میں آریہ سماج کے کردار کا جائزہ لیا ہے۔ مذکورہ کتابوں میں مناظروں کا ذکر بھی ضمناً ہوا ہے مگر ان مناظروں کا بھرپور منصفانہ وناقدانہ جائزہ نہیں لیا گیا ہے اور نہ تو ان کے اثرات پر تجزیاتی گفتگو کی گئی ہے۔ انگریزی کے علاوہ دیگر ہندی اُردو کی کتابوں میں بھی ان مناظروں کے متعلق تفصیلی بحث نہیں ملتی ہے۔ اب تک کی منظر عام پر آئیں اُردو، انگریزی، ہندی کی تمام کتابوں میں ان مناظروں کے تجزیاتی مطالعے کو مرکزی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ اجمالاً ذکر سے کام لیا گیا ہے۔ جبکہ ان مناظروں کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ عوام میں بحث ومباحثہ کے دوران عقائد اور اعمال کو دینی اور علمی اعتبار سے معیاری گفتگو کا عنوان نہیں بنایا گیا ہے بلکہ تذلیل وتضحیک، افواہ، پروپیگنڈہ اور عوامی نکتہ چینی کے لیے انھیں بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس عہد سے متعلق بہت دل آزار لب ولہجے میں مناظراتی لٹریچر کا بہت بڑا ذخیرہ اُردو میں موجود ہے جو موجودہ دَور کے اُردو سے نابلد انگریزی ہندی داں مؤرخین کی دسترس سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مضر اثرات پہ انگریزی وہندی کے مؤرخین کچھ کہنے سے قاصر ہیں اس لیے اس زمانے میں ایک دوسرے کے خلاف لکھے گئے مراسلے، کتابچے، کتب ورسائل اور اخبارات وجرائد کا منصفانہ جائزہ لینا اور اس کے مضر اثرات ونقصانات سے موجودہ ہندوستانی عوام کو بھی بچانا ہر محبّ وطن مؤرخ کا اہم ترین فریضہ ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کو آریہ سماجیوں نے انگریز حکمرانوں کی ایما پر بطور خاص اپنی جارحیت کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ دین اسلام کے عقائد وتعلیمات اور قرآن و

صاحب قرآن کا برسرِ عام تضحیک و مذاق اڑانا ان کے روزمرہ کا معمول بن گیا۔ یہ جماعت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی فرضی تصویر چھاپ کر اور توہین رسالت پر مبنی 'رنگیلا رسول' جیسی دیگر کتب و رسائل شائع کر کے اسلام مخالف طاقتوں کو خوش کرنے کا فریضہ انجام دینے لگی۔ بانی آریہ سماج سوامی دیانند سرسوتی کی متنازعہ کتاب 'ستیارتھ پرکاش' کے دوسرے ایڈیشن میں دو ابواب کا اضافہ کر کے شائع کیا گیا۔ اسی ایڈیشن کے باب چودہ میں قرآن کی مختلف سورتوں پر ۱۵۹ جاہلانہ اعتراض کیے گئے۔ اس کتاب کا پہلا اُردو ترجمہ اگست ۱۸۹۹ء میں مصنف کتاب سوامی دیانند سرسوتی کے انتقال (۳۰/ اکتوبر ۱۸۸۳ء) کے ۱۶ سال بعد شائع ہوا۔ جب کہ اصل کتاب پہلی بار ہندی میں (دیوناگری رسم الخط) ۱۸۷۵ء میں مصنف کی موت سے ۸ سال پہلے بنارس سے کل ۱۲/ ابواب پر مشتمل شائع ہوئی تھی۔ اس میں اسلام مخالف کوئی باب نہیں تھا۔ پہلی اشاعت کے ٹھیک چوبیس سال بعد ۱۸۹۹ء میں دو ابواب تیرہ اور چودہ کے اضافے کے ساتھ اُردو میں شائع ہونے والی یہ کتاب مسلمانان ہند کے لیے سخت مذہبی دل آزاری کا باعث ثابت ہوئی۔ اس کے خلاف مسلمانانِ ہند نے اپنی قلبی بے چینی کا اظہار عوامی اعتبار سے ملک گیر سطح پر کیا۔ اس مظاہرے سے ہندو اور مسلمان کے بیچ نفرت کی خلیج مزید گہری ہوئی۔ ستیارتھ پرکاش کے اس اُردو ایڈیشن میں اسلام کے خلاف شامل باب چودہ کا منصفانہ ردّ جماعت اہل سنت کی طرف سے صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے 'احقاقِ حق' اور غیر مقلد عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری نے 'حق پرکاش' کے نام سے لکھا، جسے اہلِ علم کے مختلف حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی کتاب 'حق پرکاش' ابھی بھی شائع ہو رہی ہے مگر صدر الافاضل کی کتاب 'احقاقِ حق' کو ان کی جماعت نے نہ جانے کیوں سرد خانے میں ڈال دیا۔ پاکستان کے ماہنامہ 'القول السدید' لاہور نے ۱۹۹۰ء کے شمارے سے 'احقاقِ حق' قسط وار شائع کرنا شروع کیا تھا، مگر مجھے نہیں معلوم کہ اسے کتابی شکل میں وہاں سے شائع کیا یا نہیں؟ دورانِ تحریر مجھے معلوم ہوا کہ الاشرف اکیڈمی کے زیرِ اہتمام مارچ ۲۰۰۲ء میں مولانا محمد احمد نعیمی ریسرچ اسکالر جامعہ ہمدرد دہلی نے انڈیا میں یہ کتاب ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ نئی کمپوزنگ کے ساتھ شائع کروائی ہے۔ یہ اطلاع یقیناً میرے لیے بڑی ہی خوش کن تھی۔ میں نے مولانا نعیمی سے فوری فون پر رابطہ کیا اور انھوں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ یہ کتاب مجھے تحفتاً بھیج وا دی۔

آریہ سماجیوں نے اسلام کے خلاف اُردو اور بعد میں ہندی میں کثیر تعداد میں اشتعال انگیز رسائل و کتابیں شائع کیں اور آج بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان اشتعال انگیز کتابوں کی ایک مختصر فہرست قارئین کی معلومات کے لیے حاضرِ خدمت ہے۔ سنہ طباعت سے صرف نظر کر رہا ہوں۔

۱. تقابل افکارِ مذہبی .... آتمارام امرتسری
۲. ایک ہی راستہ .... آنند سوامی خوشحال چند
۳. ہندو مسلمانوں کے میل کا پرشن؟ .... گنگا پرشاد اُپادھیائے
۴. مصابیح الاسلام .... گنگا پرشاد اُپادھیائے
۵. کون دھرم شریشٹ ہے؟ .... کرشنا نند
۶. پرانوں میں دس ہزار مسلمانوں کی شدھی .... گنگا پرشاد گپت
۷. اسلام دھرم کا تجزیہ .... گنپت رائے اگروال
۸. آریہ سماج اور ہندو سنگٹھن .... جگدیش سنگھ گہلوت
۹. آریہ سماج نے کیا کیا .... چھٹن لال سوامی
۱۰. تعارف قرآن .... دیو پرکاش
۱۱. آریہ سماج اور کانگریس .... پرمانند
۱۲. کیا اسلام امن کا علمبردار ہے؟ .... منگل نند پوری ستیاسی
۱۳. کرم وِچار .... رام لال
۱۴. وید کس پر نازل ہوئے؟ .... کرپارام شرما
۱۵. غازی میاں کی پوجا .... جگت نرائن شرما
۱۶. خطرے کا بگل .... سوریہ دیو شرما
۱۷. ہندو دھرم کی فضیلت .... بابو بیجناتھ
۱۸. آریہ درپن .... بختاور سنگھ
۱۹. ستیہ دھرم پرکاش سماچار .... پیارے لال
۲۰. تحقیقات دھرم حقیقی .... پیارے لال
۲۱. ویدک دھرم پرچار .... ٹھاکر دت دھون رائے
۲۲. اللہ میاں پر شیطان کے سوالات .... جگدمبا پرشاد
۲۳. آئینۂ مذہب ہندو اور اسلام .... جے دیال
۲۴. آریہ سماج کی تاریخ .... لالہ لاجپت رائے
۲۵. آریہ سماج اور اسلام .... سوریہ پرتاپ رائے بہادر
۲۶. آریوں کی کسوٹی .... کالی چرن
۲۷. رنگیلا رسول .... کٹالی چرن
۲۸. اصولِ تعلیم آریہ سماج .... کھڑک سنگھ پنڈت
۲۹. اظہارِ حقیقت .... گیان چند آریہ
۳۰. کلیاتِ آریہ مسافر .... پنڈت لیکھ رام آریہ
۳۱. رسالہ جہاد کی حقیقت .... پنڈت لیکھ رام آریہ
۳۲. تحریف قرآن .... پنڈت لیکھ رام آریہ
۳۳. خدا اور روح .... مہاشے پرکاش دیو
۳۴. فلسفۂ وحدت .... نرمل چند
۳۵. المصف .... نند کشور
۳۶. ابطال المتخاصمین .... یوگیندر پال آریہ

مذکورہ بالا آریہ سماجی دل آزار مناظراتی کتابوں کے جواب اور جواب الجواب میں مسلمانوں کے مختلف طبقے کے قلم کاروں نے بھی اپنے دین و مذہب کے دفاع میں

کثیر تعداد میں رسائل و کتابیں لکھیں۔ کچھ کتابوں کی ایک انتہائی مختصر فہرست پیش کر رہا ہوں۔ اس کتب فہرست میں بھی سنہ طباعت سے صرفِ نظر کر رہا ہوں:

۱۔ وید اور قرآن کا مقابلہ .... مولانا ابورحمت حسن قادری
۲۔ مباحثہ رسول پور .... مولانا ابورحمت حسن قادری
۳۔ آریوں کے پندرہ سوالوں کے جوابات .... ڈاکٹر اشرف خاں
۴۔ مقاصد اسلام .... مولانا انوار اللہ خاں فاروقی
۵۔ آریہ مذہب کا آئینہ .... سیّد ابومحمد کانپوری ثاقب
۶۔ احقاقِ حق .... علامہ نعیم الدین مرادآبادی
۷۔ ہردیال کی گھڑیال .... خواجہ حسن نظامی
۸۔ حقیقتِ وید .... مولانا حشمت علی
۹۔ وید اور قرآن .... بابا خلیل داس
۱۰۔ ڈیگ میں آریوں کی ڈینگ .... علامہ عبدالحمید پانی پتی
۱۱۔ میں مسلمان ہوگیا .... عبدالرحمٰن
۱۲۔ تحفۂ آریہ سماج .... عبدالعزیز جگد مبا پرشاد نومسلم
۱۳۔ ستیارتھ پرکاش اور مسلمان .... عبدالکریم اکبرآبادی
۱۴۔ تحریف قرآن کا جواب .... علامہ غلام قادر قصوری
۱۵۔ ساڑھے چار لاکھ مسلمانوں کا شکار .... سیّد غلام قطب الدین برہمچاری
۱۶۔ تیغ صابر بہ برعقائد آریہ .... علامہ فضل حسین
۱۷۔ ایک آریہ کے چند سوال .... علامہ محمد یوسف
۱۸۔ مناظرہ تحصیل دیوریا .... مرتب: نورالحق
۱۹۔ سرتوڑ .... غازی محمود دھرم پال
۲۰۔ کفرتوڑ .... غازی محمود دھرم پال
۲۱۔ بت شکن .... غازی محمود دھرم پال
۲۲۔ جڑمار .... غازی محمود دھرم پال
۲۳۔ حق پرکاش .... مولانا ثناءاللہ امرتسری
۲۴۔ بحث تناسخ .... مولانا ثناءاللہ امرتسری
۲۵۔ مناظرہ خورجہ .... مولانا ثناءاللہ امرتسری
۲۶۔ مناظرہ جبل پور .... مولانا ثناءاللہ امرتسری
۲۷۔ مقدس رسول .... مولانا ثناءاللہ امرتسری
۲۸۔ مباحثہ رڑکی .... مولانا محمد قاسم نانوتوی
۲۹۔ تثلیث وید .... مولانا عبدالصمد رحمانی
۳۰۔ اسلامی شرک کا جواب .... مولانا عبدالصمد رحمانی
۳۱۔ آریہ دھرم کا انصاف .... مولانا عبدالصمد رحمانی
۳۲۔ آرین ایشور .... علامہ فیض الحسن سہارنپوری
۳۳۔ توحید کا آئینہ .... مولوی حسین احمد بدایونی
۳۴۔ ازالۃ الشکوک .... سید صادق حسین
۳۵۔ ہدایت آریہ .... علامہ محمد یوسف
۳۶۔ ہندو دھرم اور اسلام .... قاری سرفراز حسین
۳۷۔ تحریف وید .... مولانا محمد عبدالشکور مرزاپوری
۳۸۔ مثنوی نیوگ .... علامہ عبدالکبیر خاں
۳۹۔ ویدوں کی تہذیب .... علامہ عبدالکبیر خاں
۴۰۔ آریوں کے پچیس سوالوں کے جواب .... علامہ عبدالکبیر خاں
۴۱۔ کل جگی نیوگ .... علامہ شیخ الہٰ دین
۴۲۔ آریہ شکن .... مولانا محمد ادریس رحمانی
۴۳۔ دیانندی تعلیم کا فوٹو .... علامہ محمد عبداللہ
۴۴۔ ثمراتِ تناسخ .... علامہ محمد انصاری امرتسری
۴۵۔ مجادلہ حسنہ .... سید معظم علی مرادآبادی
۴۶۔ سچا دھرم اور اس کی پہچان .... حکیم حفیظ الدین لکھنوی
۴۷۔ غبارِ اُفق .... علامہ سید غلام بھیک برنگ
۴۸۔ شدھی توڑ .... علامہ حمید حسن بجنوری
۴۹۔ تنزیل .... علامہ ظہور احمد بدایونی
۵۰۔ ویدک ایشور کی حقیقت .... علامہ رحیم بخش سکندری
۵۱۔ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت .... علامہ فیروز دسنوی
۵۲۔ برق اسلام بہ ترک اسلام .... علامہ منشی کریم بخش
۵۳۔ مطرقۃ الحق .... علامہ مولانا حکیم محمد اسحاق کانپوری
۵۴۔ مسلمان اور آریہ .... علامہ سید الطاف حسین دہلی
۵۵۔ اٹل ہرسکوت .... خواجہ محمد نوح مخزوں
۵۶۔ آئینۂ حق نما .... حکیم محمد عبدالحئی
۵۷۔ سوامی جی کے اعتراضات کے جوابات .... عبدالحق ودیارتھی
۵۸۔ ویدوں کی ظلمرانی .... علامہ عبدالکبیر خاں

نوٹ: ہندو پاک کے قارئین سے گزارش کی جاتی ہے کہ اگر اس سلسلے میں انھیں کوئی مزید معلومات حاصل ہو یا آریہ سماجی مسلم مناظروں کے متعلق کسی مناظرے یا کتبِ مناظرہ کا علم ہو تو براہِ کرم اس سے مجھے مطلع کریں۔ میں اس موضوع پر بہت ہی جامع اور تحقیقی کام کر رہا ہوں۔ قارئین سے بھی اس حوالے سے تمام طرح کی معلومات فراہم کرنے کی پرزور گزارش کی جاتی ہے۔ امید کہ آپ اپنے علمی تعاون سے ہماری مدد کر کے عنداللہ اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے۔ □□

ای میل: naushadchishti@yahoo.com، موبائل: +919412562751

منظومات

نعت شریف

جلوہ گاہِ عالم میں بے خودی سی طاری ہے
آمدِ شہِ بطحا ، نور کی سواری ہے

آئینہ نما سینہ، ذہن و دل منوّر ہیں
وردِ اسمِ نورانی یوں لبوں پہ جاری ہے

سر بہ سجدہ سورج ہے بارگاہِ اقدس میں
انکسار ہے کیسا، کیسی خاکساری ہے

یہ تفکرِ تاباں کیوں نہ عرش کو چھولے
شہرِ نورِ احمد میں میرا فن بھکاری ہے

سائبان ہے مکی، در دریچہ ہے مدنی
ہم نے اپنی تنہائی اس طرح سنواری ہے

کاغذی خزانے سب کیوں نہ ہوں گہر افشاں
انگلیوں کی پوروں سے جب درود جاری ہے

سر پہ نیک لمحوں کے تاج آپ نے رکھا
تا ابد صبا اُن کی ہر سو تاج داری ہے

علیم صباؔ نویدی
۱۹۲، ٹرپلیکین ہائی روڈ، سیکنڈ فلور، فلیٹ نمبر ۱۶، رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی-۶۰۰۰۰۵

نعت شریف

میں بھی قسمت سے کہیں گنبدِ خضریٰ دیکھوں
اوج پر اپنے مقدر کا ستارہ دیکھوں

میری حسرت ہے کہ میں نور خدا کا دیکھوں
روضۂ شاہِ دوعالم کا نظارہ دیکھوں

سر جھکاؤں تو الٰہی ترا کعبہ دیکھوں
سر اُٹھاؤں تو شہِ دین کا روضہ دیکھوں

مجھ گنہگار پہ کردے جو نظر ماہِ عرب
چاند، تاروں سے سوا خود کو چمکتا دیکھوں

جس کے دیدار کی حسرت تھی اسے دیکھ لیا
زندگی اب ترا کیا خاک تماشہ دیکھوں

تلوۂ شاہِ امم بھا گیا نظروں کو شہیرؔ
پھر بتا کس لیے میں چاند فلک کا دیکھوں

شہیرؔ رضوی کھیروی
سیدواڑہ، کھیری، یوپی-۲۶۲۷۰۲

محمد آصف علی ☆

اللہ سے تعلق کے پانچ اصول

تعلق باللہ:

اقامت دین کے لیے جوصفت مقدم ہے وہ تعلق باللہ ہے۔ دنیا میں کوئی شخص کام کرنے کے لیے اُٹھتا ہے خواہ وہ کام کچھ بھی ہو اس کی اصل محرک وہ غرض ہوتی ہے جس کی خاطر وہ کام کرنے اٹھتا ہے اور اس میں سرگرمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ اس غرض کے ساتھ آدمی کی دلچسپی میں گہرائی اور گرم جوشی ہو۔ بلاشبہ ہم نے جس کام کا عہد کیا ہے اور جس گراں بار ذمے داری کا بیڑہ اٹھایا ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم اللہ کو راضی کریں اور اس کام میں آسانیاں اسی وقت پیدا ہوں گی جب ہمارا تعلق اللہ سے مضبوط و گہرا ہوگا، جس کا تعلق اللہ کی ذات سے جتنا گہرا ہوگا وہ یہ کوشش کرتا رہے گا کہ اللہ کو راضی کرنے والی چیزیں کون سی ہیں، اس کو انجام دے اور ان تمام کاموں سے اجتناب کرے گا جس سے اللہ تعالیٰ ناراض اور ناخوش ہوتا ہے اور اللہ کو راضی کرنے کے جو کام بھی ہیں وہ دل کی کامل یکسوئی و رغبت سے انجام دے گا اور اس کوشش میں کسی اور کو راضی کرنے کا شائبہ تک نہ ہوگا۔ تعلق باللہ سے کیا مراد ہے؟ اس کا صحیح جواب قرآن میں اس طرح ملتا ہے: اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. یعنی میرے تمام مراسم عبودیت، میری نماز، میرا جینا اور میرا مرنا سب کا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

تعلق باللہ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ خدا کی ذات پر کامل یقین ہو پھر اس کے بعد جو کام بھی انجام دیے جائیں پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ہوں اور دوسرا کام عمل ہے اور عمل کے ذریعے ہی تعلق باللہ کو تقویت ملتی ہے۔ تعلق باللہ کو تقویت پہنچانے والے ذرائع حسبِ ذیل ہیں:

1. تعلق باللہ کا اہم ذریعہ عبادات میں خشوع و خضوع ہے۔ فرائض و سنن کے علاوہ نوافل کا اہتمام بھی کیا جائے اور بالخصوص تہجد کی پابندی ہو۔
2. ذکرِ الٰہی کا وِرد کریں، ورد کو ہر حال میں اور ہر جگہ جاری رکھیں۔ اس سے دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے اور دِلوں کو سکون نصیب ہوتا ہے۔
3. ہر طرح کی قربانی جو خالص اللہ کی خاطر کی جائے بالخصوص انفاق فی سبیل اللہ۔
4. مطالعہ قرآن اور اسلامی لٹریچر بھی اللہ سے تعلق قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔
5. تعلق باللہ کو بڑھانے کے لیے کثرت سے دعاؤں کا اہتمام کریں۔

اسلامی نظام زندگی کا برپا کرنا ایک ایسا کام ہے جس میں کوئی کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آدمی کا تعلق اللہ کے ساتھ صحیح، مضبوط اور گہرا نہ ہو اور اس کی نیت خالصتاً اللہ ہی کے لیے کام کرنے کی نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جس چیز کو آدمی قائم کرنا چاہتا ہے وہ اللہ کا دین ہے اور اسے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی سب کچھ اس خدا کے لیے کرے جس کا یہ دین ہے۔ اسی کی رضا اس کام میں مطلوب ہونا چاہیے، اسی کی محبت اس کے لیے واحد محرک ہونی چاہیے، اسی کی تائید و نصرت پر کلی اعتماد ہونا چاہیے اور اسی سے اجر کی ساری اُمیدیں وابستہ ہونی چاہیے۔ اللہ سے تعلق کی انتہا یہ ہو کہ ہر طرح کے معاملات چاہے دوستی ہو یا دشمنی صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔

یادِ الٰہی:

اللہ کا ذکر ایک عبادت ہے اس کے بغیر مومن کو وہ زندگی میسر نہیں آسکتی جو اسلام میں مطلوب ہے۔ اللہ کا ذکر مومن کے لیے نہ صرف مطلوب ہے بلکہ اس کے ذہن وفکر کی بقا اور اس کے ارتقا کے لیے نہایت ہی ضروری ہے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ کوئی بھی جگہ کبھی خالی نہیں ہوتی اگر وہاں سے بھری ہوئی چیزیں نکال لیں تو فوراً ہوا اس کی جگہ لے گی۔ ٹھیک اسی طرح سے انسان کا ذہن بھی اللہ کے ذکر سے خالی رہے گا تو اس خلاف کو فوراً شیطان پراگندہ خیالات سے ذہن پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے گا جو اللہ کے ذکر سے خالی ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ شیطان برائی پر اکسائے گا اور غلط کاموں کی ترغیب دے گا۔ لہٰذا ایک مومن کو چاہیے کہ ہمیشہ اللہ کے ذکر سے دِلوں کو تازہ رکھے۔ اللہ کے ذکر سے کیا مراد ہے؟ اس کا جاننا نہایت ہی ضروری ہے۔ اس لیے کہ آج معاشرے میں ذکر سے متعلق بہت ساری بدعات رائج ہیں۔ کچھ لوگوں نے ذکر اللہ کو ایک وظیفہ تک محدود کر لیا ہے اور ایک طبقہ اللہ کے ذکر کے تئیں بے راہ روی کا شکار ہے۔ ہمیں اس موقع پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حقیقتِ ذکر کیا ہے۔ قرآن میں اس کی صحیح تعریف ہمیں اس طرح ملتی ہے۔

قرآن مقدس میں ہے: ''اے لوگو! جو ایمان لائے، اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہو۔'' (احزاب: ۴۱، ۴۲)

قرآن میں ایک اور جگہ ذکر اللہ سے متعلق تشریح ملتی ہے۔ وہ اس طرح ہے: ''کھڑے، بیٹھے اور لیٹے اللہ کی یاد میں لگے رہو۔'' (سورۂ نساء: ۱۰۳)

ہر حال میں اللہ کے ذکر کی تلقین کی گئی ہے۔ اللہ کا ذکر عارضی شے نہیں ہے بلکہ ایک ایسی کیفیت ہے جس سے دِلوں کو سکون ملتا ہے اور قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون مل سکتا ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جن کے دلوں کو اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ سن رکھو، اللہ کی یاد ہی سے دِلوں کو سکون ملتا ہے۔ (سورۂ رعد: ۲۸)

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ کو نہ صرف یاد کرو بلکہ کثرت سے یاد کرو اور جو کثرت سے یاد کرتے ہیں انھیں اجرِ عظیم کی خوشخبری دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو: ''اللہ کو

☆ الرضا منزل، کریم گنج، پورن پور، پیلی بھیت، یوپی

کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے بخشش اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔" (سورۂ احزاب: ۳۵)

اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے کا مطلب ہے کہ آدمی کی زبان پر ہر وقت زندگی کے ہر معاملے میں کسی نہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کا نام آتا رہے۔ یہ کیفیت آدمی پر اس وقت تک طاری نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خیال بس کر نہ رہ گیا ہو۔ انسان کے شعور سے گزر کر اس کے تحت الشعور اور لاشعور تک میں جب یہ خیال گہرا اُتر جاتا ہے، تب ہی اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ جو کام اور جو بات بھی کرے گا اس میں اللہ تعالیٰ کا ضرور نام آئے گا۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد مانگے گا، ہر نعمت ملنے پر اس کا شکر ادا کرے گا، ہر آفت آنے پر اس کی رحمت کا طلب گار ہوگا، ہر مشکل میں اس سے رجوع کرے گا، ہر برائی کا سامنا کرنے پر اس سے ڈرے گا، ہر قصور سرزد ہو جانے پر اس سے معافی چاہے گا اور ہر حاجت پیش آنے پر اس سے دعا مانگے گا۔ غرض اٹھتے بیٹھتے اور دنیا کے سارے کام کرتے ہوئے اس کا وظیفہ اللہ ہی ہوگا۔

انسان کا علم، انسان کی عقل، انسان کے دل و دماغ اور اس کے فکر و نظر کو جو روشنی بھی نصیب ہوتی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی یاد ہی سے ہوتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان کا باطن بالکل تاریک رہتا ہے اور اس کا ہر کام گو بظاہر کتنا ہی اچھا نظر آتا ہو بالکل غلط معلوم ہوتا ہے اس کا دل اس کو غلط مشورے دیتا ہے اور اس کا دماغ غلط رہنمائی کرتا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں جس راہ میں اور جس مقصد کے لیے بھی اٹھتے ہیں غلط ہی اٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص دین کا نام لے کر اٹھے اور دین ہی کا کام کرنا چاہے لیکن خدا کی یاد سے اس کا دل خالی ہو جائے تو اس کی وہ دینداری بھی دنیا داری بن جاتی ہے۔ جو لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی انھیں یاد کرتا ہے۔ قرآن میں اس طرح ہے کہ "تم مجھے یاد کرو میں تم کو یاد رکھوں گا اور میرے شکر گزار بنو اور کفرانِ نعمت نہ کرو۔" (بقرہ: ۱۷۲)

اللہ کی یاد سے غافل کرنے والی دو چیزیں ہیں ایک مال اور دوسری اولاد۔ ملاحظہ ہو، قرآن میں یوں کہا گیا ہے: "اے ایمان والو! تمھارے مال تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور نہ تمھاری اولاد اور جو کوئی ایسا کرے گا تو ایسے ہی لوگ خسارے میں پڑنے والے ہیں۔" (المنافقون: ۹)

فکرِ آخرت:

فکر آخرت ایک ایسا وصف ہے جو مومن کو ہمیشہ صحیح سمت میں رکھتا ہے اور اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ آخرت ابدی اور باقی رہنے والی ہے اور آخرت کا احساس داعی کو اپنی ساری دولت، وقت اور توانائی خرچ کرنے اور دنیاوی راحت و سکون قربان کر دینے پر اُبھارتا ہے کیونکہ آخرت دائمی اور باقی رہنے والی ہے۔ قرآن کہتا ہے: "آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔" (سورۃ الاعلیٰ: ۱۷)

دنیا میں انسان کا وجود محض اس لیے نہیں ہوا کہ وہ موج مستی کرے بلکہ اس لیے ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک خاص مدت تک امتحان کے مرحلے سے گزار کر آزمانا چاہتا ہے تاکہ دیکھیں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ جو لوگ صحیح عمل کریں گے انھیں ان کا بدلہ دیا جائے گا اور کسی نے غلط راہ کو اختیار کیا ہوگا اسے بھی وہاں سزا دی جائے گی۔ قرآن کہتا ہے: "پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔" (زلزال: ۷، ۸)

جو لوگ آخرت کا شعور رکھتے ہیں وہ اس بات سے واقف ہوتے ہیں کہ کہیں اللہ تعالیٰ ان کی چھوٹی چھوٹی حرکات پر پکڑ نہ کر لے وہ اس خوف سے ڈرتے ہیں۔ قرآن میں اسے اس طرح کہا گیا ہے: "وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔" (سورۂ رعد: ۲۱)

اگرچہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے لیکن مومن کی نگاہ ہمیشہ آخرت میں کامیابی پر ٹکی ہوتی ہے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بھی یہ گوارہ نہیں کرتا کہ دنیا سے دل لگائے اور نتیجتاً آخرت میں نقصان اٹھانا پڑے۔ اور مومن اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ آخرت کی کامیابی دراصل حقیقی کامیابی ہے۔ چاہے اس کے لیے دنیا میں رسوا ہونا پڑے، مصیبتیں اٹھانی پڑیں، ہر طرح کی مذمت سہنی پڑے اور دنیا کی ان تمام چیزوں کا نقصان برداشت کرنا پڑے، یہ ممکن ہے لیکن آخرت میں رُسوا ہونا پڑے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔ عقیدۂ آخرت پر یقین ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا شعور ہو اس لیے آخرت کو ذہن میں تازہ کرتے رہنا چاہیے ورنہ یہ عین ممکن ہے کہ مرغوبات دنیا کہیں آخرت سے موڑ کر دنیا کی طرف کھینچ نہ لیں۔ آخرت ایک غیر محسوس شے ہے جو کل ظاہر ہونے والی ہے جبکہ دنیا ایک محسوس شئے ہے۔ یہاں اس کی تلخیاں و شیرینیاں ہر وقت چھلکتی رہتی ہیں۔ اگر کوئی اس کے دام فریب میں آ جائے تو آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔

فکر آخرت کا پہلا مرحلہ موت کی یاد ہے۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی فرد انکار نہیں کر سکتا۔ ذرا غور کیجیے کہ اس کائنات میں موت سے زیادہ یقینی حقیقت اور کیا ہوگی؟ لیکن انسان نہ جانے کیوں اس سے غفلت کا شکار ہے۔ دنیا کی پر تعیش زندگی، شان و شوکت اور مال کی حرص نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے اور ایسے لوگ گور (قبر) تک پہنچ جاتے ہیں لیکن خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے ذہنوں میں آخرت کا تصور اور جوابدہی کا احساس دھندلا تو نہیں ہو گیا ہے؟ کچھ لوگوں کے ساتھ ایسا معاملہ بھی ہے کہ وہ بہتوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر مٹّی کے سپرد کر کے چلے آتے ہیں لیکن آخرت کا احساس بیدار نہیں ہوتا۔

قبل اس کے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے رُسوا ہوں، ہم جاگ جائیں، کثرت سے موت کو یاد کریں، بار بار آخرت کو ذہنوں میں تازہ کریں، اس کے لیے کبھی کبھی قبرستان بھی جایا کریں، جہنم کے ہولناک مناظر کا مطالعہ کریں اور تصور کریں کہ جنت کی وہ لازوال نعمتیں نیک و صالح لوگوں کو عطا کی جائیں گی اور

کیسے عالیشان محلات ہوں گے جس میں جنتی رہیں گے۔ کاش! ہم بھی اس میں رہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں جنت الفردوس عطا کرے۔ (آمین)

توبہ و استغفار:

توبہ کے معنی لوٹنے اور پلٹ آنے کے ہیں اور استغفار کے معنی ماضی کے گناہوں سے معافی مانگنا ہے۔ شریعت میں توبہ اسے کہتے ہیں کہ خوف سے گناہ کو چھوڑ دینا اور اس کی قباحت کو محسوس کر کے اس پر نادم ہونا اور اس بات کا عزم کرنا کہ اب برائی کا ارتکاب نہیں ہوگا۔ توبہ دراصل اس دلی احساس کو کہتے ہیں جو گناہوں کے ارتکاب پر ندامت کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔

سچی توبہ کا لازمی تقاضا ہے کہ جو برائی پہلے کسی شخص نے کی ہے اس کی تلافی کرنے کی وہ اپنی حد تک پوری کوشش کرے اور جہاں تلافی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو وہاں اللہ سے معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے اس دھبے کو دھوتا رہے جو اس نے اپنے دامن پر لگالیا ہے۔ لیکن کوئی توبہ اس وقت تک حقیقی توبہ نہیں ہے جب تک کہ وہ اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے نہ ہو۔ کسی دوسری وجہ یا غرض سے کسی برے فعل کو چھوڑ دینا سرے سے توبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔

قرآن میں اللہ نے بندوں کو توبہ کرنے کی ترغیب اس طرح دی ہے: کہہ دو اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ تو سب گناہوں کو بخشتا ہے وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔ اور ایک جگہ قرآن میں ہے کہ: اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

دنیا میں ہر انسان غلطی کرتا ہے لیکن بہترین شخص وہ ہے جو اپنی غلطی پر اڑا نہیں رہتا بلکہ اس پر ندامت کرتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر انسان خطا کار ہے اور بہترین خطا کار توبہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ (ترمذی)

بشری کمزوری کے سبب انسان خطا کرتا ہے اور جب اسے اللہ یاد آتا ہے تو وہ اپنے رب کی طرف لوٹتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ”جن کا حال یہ ہے کہ ان سے جب کوئی برا کام ہو جاتا ہے یا کوئی گناہ کر کے اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو انھیں اللہ یاد آجاتا ہے۔ وہ اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو معاف کرسکتا ہے۔“ (آل عمران: ۱۳۵)

”جو لوگ توبہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نہ صرف انھیں معاف کر دیتا ہے بلکہ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ توبہ کرنے کے بعد جب مومن نیک عمل کرتا ہے تو اس کے گناہوں کے بدلے بھی نیکیاں لکھ دی جاتی ہے مگر یہ کہ جو شخص توبہ کرے ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔“ (الفرقان: ۱۷۰)

”توبہ و استغفار کرنے سے جہاں گناہ معاف ہوتے ہیں وہیں مومن کے درجات بلند ہوتے ہیں اور کامیابی کے راستے کھلتے ہیں: اے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو۔ توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔“ (سورۂ نور: ۳۱)

توبہ و استغفار ایک ایسی صفت ہے جو مومن کی شعوری زندگی سے شروع ہوتی ہے اور زندگی کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی ہے اور مومن کسی بھی وقت اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ روز مرہ کی زندگی میں داعی سے چھوٹے چھوٹے گناہ ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی پناہ طلب کرنا ضروری ہے، کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ دن میں سو بار خدا سے استغفار کرتے تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو اور اس کی طرف پلیٹ آؤ۔ مجھے دیکھو میں دن میں سو بار خدا سے مغفرت کی دعا کرتا رہتا ہوں۔ (مسلم)

دعا کا اہتمام:

دعا کی افادیت کا ذکر قرآن میں جا بجا ملتا ہے۔ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور دعا عبادت کا مغز بھی۔ دعا کے معنی پکارنا، بلانا، مانگنا اور سوال کرنا ہے۔ جس طرح عبادت خالص اللہ کے لیے ہے اسی طرح دعا بھی خالص اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ دعا سے عبادت کرنے والوں کو تقویت ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کو دُعا کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اُدعُونِی اَستَجِبْ لَکُمْ (مجھے پکارو میں تمھاری پکار کو سنتا ہوں) بندہ جب دعا کرتا ہے تو کبھی کبھی دنیا میں بندے کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں جن دعاؤں کے اثرات دنیا میں ظاہر نہیں ہوتے وہ آخرت کا ذخیرہ بن جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بندے کو دعا مانگنے کا طریقہ بتایا ہے۔ فرماتا ہے: ”اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔“ (سورۂ اعراف: ۵۵، ۵۶)

”شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے۔ وہ ہر وقت کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح انسان کو غلط راہ پر لے جائے۔ برائی پر اُکسائے، داعیان حق کو خوف زدہ کرتا ہے اور حرص و لالچ کے جال بچھا کر انھیں راہ حق سے موڑنا چاہتا ہے۔ شیطان کے بچھائے ہوئے جال سے وہی شخص بچ سکتا ہے جس کو اللہ کی پناہ مل گئی ہو۔ اس لیے دعا سکھائی گئی ہے۔ دعا کرو کہ پروردگار! میں شیاطین کی ان ترغیبات سے تیری پناہ مانگتا ہوں بلکہ اے رب! میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئے۔“ (سورۃ المومنون: ۹۶-۹۷)

روز مرّہ کی زندگی میں مومن سے ایسے گناہ بھی ہو جاتے ہیں جس کا اسے احساس بھی نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ ایسے گناہوں پر بھی گرفت فرمانے والا ہے لہٰذا ہمیں ان گناہوں کی بھی معافی مانگنی چاہیے جو انجانے میں ہوئے اور ہر وقت دعاؤں کے ذریعے اللہ سے مغفرت طلب کرنی چاہیے۔ ❑❑

مولانا صابر رضا رہبر مصباحی ☆

میراث کی تقسیم: ذمہ داریاں اور کوتاہیاں

تاریخ وراثت کا بدنما دَور:

اسلام سے قبل جس طرح لوگ اپنی طاقت کے بل پر کارزارِ حیات کے ہر شعبے میں شر پسندی کی حدود کو پار کر چکے تھے اسی طرح میدان وراثت بھی اس انتہا پسندی سے خالی نہ تھا۔ میّت کے اموالِ متروکہ میں حصے داری کا حق صرف اور صرف مردوں کو حاصل تھا وہ بھی اس کو جو جوان اور میدانِ حرب وضرب کے لائق ہوتا۔ چونکہ کمزور، ناتواں، ضعیف، بچے اور عورت اس فطری قوت سے محروم ہوتے اس لیے وہ میّت کے اموالِ متروکہ میں حصے داری سے محروم قرار پاتے۔ بے غیرتی و بے شرمی کا یہ عالم تھا کہ میّت کے مالِ متروکہ میں اس کی بیوی بھی شامل ہوتی تھی اور وہ جس کے حصے میں جاتی وہ اس کو اپنی بیوی یا لونڈی بنالیتا خواہ وہ اس کا سگا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یتیم بچیوں کی حالت تو اور ناگفتہ بہ تھی اگر وہ مال و دولت کے ساتھ ساتھ زیورِ حسن و جمال سے بھی آراستہ ہوتیں تو دولت کی حرص میں تھوڑے مہر پر ان سے رسماً نکاح کر لیتے لیکن اگر وہ بدقسمتی سے حسن و جمال کی ثروت سے محروم ہوتیں تو پھر ان کا جینا دوبھر ہو جاتا اور ان کی زندگی جہنم بن جاتی کیونکہ نہ تو وہ خود اس کو اپنی نکاح میں لاتے اور نہ ہی اس خوف سے کہ کہیں اس دولت میں کوئی دوسرا حصہ دار نہ ہو جائے اور نہ کسی دوسرے سے نکاح کی اجازت دیتے اور یوں ہی یتیم بچیوں کی مسرتوں کا نشیمن حرص و ہوس کے شعلے میں جل کر خاکستر ہو جاتا۔ یہ خستہ حالی صرف ملک عرب کا حصہ نہ تھی بلکہ پورا عالم اس لعنت سے دو چار تھا۔ خود ہمارا ہندوستان جس کو اپنی تہذیب وتمدن پر بڑا فخر تھا اس کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ راجاؤں کا دولت کی حرص میں اپنی سگی بہن سے بیاہ رچانا اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

علم میراث کا رشتہ فقہ سے ہے اور یہ اس کا ایک درخشاں گوشہ ہے جس نے اپنی اہمیت وافضلیت کی وجہ سے مستقل ایک فن کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر لی۔ اسلام نے علم میراث کے حصول پر بڑا زور دیا اور اسے نصف علم قرار دیتے ہوئے علم الفرائض کہا ہے۔ علم فرائض کہتے ہیں: **علـم باصول من فقه و حساب يعرف به حق الورثة** یعنی علم فقہ و علم حساب کے ان قوانین کو جاننا جن کے ذریعے ترکۂ میت میں اس کے وارثوں کا حق معلوم کیا جائے۔ (تفہیم الفرائض: ص ۳۱، از: ڈاکٹر عاصم اعظمی)

علم میراث کا جاننا فرض کفایہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: **تعلموا الفرائض وعلموها الناس فانها نصف العلم** یعنی تم لوگ فرائض سیکھو اور اسے لوگوں کو سکھاؤ کیونکہ وہ نصف علم ہے۔ سب سے پہلے جو علم ہمارے درمیان سے اٹھالیا جائے گا وہ علم میراث ہے اور اس کے اثرات بھی نمایاں ہونے لگے ہیں۔ بیشتر مدارس میں اس فن میں بس ایک کتاب 'سراجی' داخل نصاب ہے اور ہماری آنے والی نئی نسلوں نے بھی اس فن میں دلچسپی کا مظاہر کرنا کم کر دیا ہے جو بڑے افسوس کی بات ہے۔

مشکوۃ شریف باب العلم، ص ۳۸ میں ہے:

''علم فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیوں یہ نصف علم ہے اور یہ علم بھلا دیا جائے گا اور میری امت میں جو چیز علم سب سے پہلے اٹھائی جائے گی وہ علم فرائض ہے یعنی فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کہ میں دنیا سے اٹھالیا جاؤں گا اور یہ علم بھی عن قریب اٹھالیا جائے گا اور فتنے ظاہر ہوں گے یہاں تک کہ وہ شخص حصے کے بارے میں اختلاف کریں گے اور وہ ایسے شخص کو نہ پائیں گے جو ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ ایک اور حدیث میں ہے: فرائض اور قرآن کو سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیونکہ میں ظاہری حیات سے وصال پانے والا ہوں۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ فرائض کی تعلیم اس طرح حاصل کرو جس طرح قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہو۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو قرآن کو سیکھے اور فرائض نہ سیکھے وہ ایسا ہی ہے جیسے بے سر کا آدمی بغیر فرائض سیکھے بے رونق رہے گا۔

(تفہیم الفرائض: ص ۱۷)

افقِ عالم پر جیسے ہی اسلام کا نیر تاباں طلوع ہوا ظلمتوں کا بادل چھٹ گیا۔ ظلم وستم اور استبداد کی زنجیریں ٹوٹ گئیں اور چہار دانگ عالم میں مسرتوں کا سماں بندھ گیا۔ اسلام نے دنیا کے سامنے ایک ایسے معتدل نظامِ وراثت کا خاکہ پیش کیا جو فطرت اور عائلی زندگی کا ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ منصفانہ پہلوؤں کا بھی احاطہ کئے ہوئے تھا اور اس کی بنیاد ظلم و ستم اور طاقت وقوت پر نہیں بلکہ **الاقرب فالاقرب** کے تحت انسانیت کے مقدس رشتوں پر تھا۔ اسلام کے اس پیغام آفریں کو سن کر نہ جانے کتنے

لب ہائے نازک پر مسکراہٹوں کی شبنم رقص کرنے لگی جو ایک تبسم کی چاہ میں خشک ہوکر خاردار لباس اوڑھ چکے تھے اور مایوسی و ناکامی اور مظلومیت کو اپنا مقدر تصور کر چکے تھے۔ ہم آئندہ سطور میں وہ چند قرآنی آیات اور احادیث نبویہ ذکر کریں گے جن سے وراثت کے اصول وضوابط متفرع ہوتے ہیں۔

للرجال نصیب مما ترک الولدان والاقربون وللنساء نیب مما ترک الولدان والاقربون. (سورۃ النساء: پارہ ۴، آیت ۷)

یعنی مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قرابت والے اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قرابت والے۔

اس آیتِ کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت اوس بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور انھوں نے بہت سارا مال چھوڑا۔ ورثے میں اک بیوی تین لڑکیاں اور دو چچیرے بھائی سوید اور عرفجہ کو چھوڑا۔ زمانۂ جاہلیت کے دستور کے مطابق ان کے سارے اموالِ متروکہ پر ان کے چچیرے بھائی سوید اور عرفجہ نے اپنا قبضہ جما لیا اور ان کی بچیوں اور بیوی کو محروم کر دیا گیا۔ اس پر ان کی بیوی ام کحہ نے کہا کہ جب تم نے سارا مال لے لیا تو ان کی بچیوں سے نکاح بھی کرلو۔ مگر ان کی لڑکیاں حسن و جمال کے زیور سے آراستہ نہ تھیں اس لیے انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ یہ سن کر ام کحہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض گزار ہوئیں کہ میرے شوہر اوس بن ثابت انتقال کر گئے انھوں نے میرے ساتھ تین بچیوں کو چھوڑا اور ان کے تمام مال کو ان کے چچازاد عرفجہ اور سوید نے لے لیا اور وہ ان بچیوں سے شادی کرنے کو بھی تیار نہیں ہے۔ اب میں کس طرح گزر اوقات کروں بچیوں کی پرورش کس طرح کروں۔ اس پر درد داستان سن کر سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کافی متاثر ہوئے اور آپ نے عرفجہ اور سوید کو بلایا اور اس سے اس کی وجہ دریافت فرمائی تو انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہماری قوم میں میت کے مال کے وراث مرد ہی ہوا کرتے ہیں۔ عورتوں اور نابالغوں کو اس میں سے کچھ نہیں دیا جاتا اس کے بعد اس آیت کریمہ کا نزول ہوا:

(ترجمہ) اللہ تمھیں حکم دیتا ہے تمھاری اولاد کے بارے میں۔ بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں کے برابر۔ پھر اگر صرف لڑکیاں ہوا گرچہ دو سے اوپر تو ان کو ترکے کی دو تہائی اور اگر ایک لڑکی ہو تو اس کا آدھا اور میت کے ماں باپ ہر ایک کو اس کے ترکے سے چھٹا اگر میت کے اولاد ہو۔ اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور ماں باپ چھوڑے تو ماں کا تہائی پھر اگر اس کی کئی بہن ہو تو ماں کا چھٹا بعد اس وصیت کے جو کر گیا اور دین (قرض) کے۔ تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے تم کیا جانو کہ اس میں کون تمھارے زیادہ کام آئے گا۔ ہر حصہ باندھا ہوا ہے اللہ کی طرف سے۔ بے شک اللہ علم والا حکمت والا ہے۔ (سورۃ النساء: پارہ ۴، آیت ۱۱)

قرآن شریف میں مزید فرمایا گیا:

(ترجمہ) اور تمھاری بیویاں جو چھوڑ جائیں اس میں تمھیں آدھا ہے اگر ان کی اولاد نہ ہو پھر اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے ترکے میں سے تمھیں چوتھائی ہے جو وصیت وہ کر گئیں اور دین (قرض) نکال کر اور تمھارے ترکے میں عورتوں کا چوتھائی ہے اگر تمھارے اولاد نہ ہو پھر اگر تمھارے اولاد ہو تو ان کا تمھارے ترکے میں آٹھواں ہے جو تم وصیت کر جاؤ اور دین (قرض) نکال کر اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کا ترکہ بٹتا ہو جس نے ماں باپ اولاد کچھ نہ چھوڑے اور ماں کی طرف سے اس کا بھائی یا بہن ہے تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا۔ پھر اگر وہ بہن بھائی سے زیادہ ہوں تو سب تہائی میں شریک ہیں۔ میّت کی وصیت اور دین (قرض) نکال کر جس میں اس نے نقصان نہ پہنچایا ہو۔ یہ اللہ کا ارشاد ہے۔ اللہ علم والا حلم والا ہے۔ (سورۂ نساء: آیت نمبر ۱۲)

(ترجمہ) تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں تم فرمادو کہ اللہ تمھیں کلالہ میں فتویٰ دیتا ہے اگر کسی مرد کا انتقال ہو جو بے اولاد ہے اور اس کی ایک بہن ہو تو ترکے میں اس کی بہن کا آدھا ہے اور مرد اپنی بہن کا وارث ہوگا اگر بہن کی اولاد نہ ہو پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ترکہ میں ان کا دو تہائی اور اگر بھائی بہن ہو مرد بھی عورتیں بھی تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ (سورۂ نساء: پارہ ۵-۶)

(۱) بیٹی کے لیے آدھا ہے اور جو باقی بچ جائے وہ سگی بہن کے لیے ہے (یہ اس وقت ہے جب یہی دونوں میت کے وارث ہوں) حقیقی وارث بھائی ہوں گے (ان کی موجودگی میں) علاتی بھائی وارث نہ ہوں گے آدمی اپنے بھائی کا وراث ہوتا ہے جو ماں باپ دونوں کی طرف سے ہو (یعنی سگا بھائی) اور صرف باپ کی طرف سے بھائی بھائی کا وراث نہ ہوگا۔

(۲) ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میرا پوتا انتقال کر گیا ہے اس کے ترکے میں میرا کتنا حصہ ہوا؟ آپ نے فرمایا تیرے لیے چھٹا حصہ ہے جب وہ واپس ہوا تو بلایا اور

فرمایا تیرے لیے دوسرا چھٹا حصہ اصل حق سے زائد ہے۔
(۳) تاریخ الخلفاء میں ہے کہ ایک شخص کی دادی یا نانی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ میرا پوتا یا نواسہ مرگیا ہے (راوی کو شک ہے کہ انھوں نے پوتا کہا یا نواسہ) اور مجھے بتایا گیا ہے کہ بحکم قرآن پاک اس کی میراث میں میرا حق ہے۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ میں قرآن مقدس میں تیرا حصہ نہیں پاتا میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تمھارے متعلق کچھ فیصلہ فرماتے نہیں سنا لیکن صحابۂ کرام سے پوچھتا ہوں تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے دادی کو چھٹا حصہ دیا۔
(۴) حضرت عمر کے پاس ایک دادی آئی اور میراث کا سوال کیا تو آپ نے فرمایا دادی کا چھٹا حصہ ہے اگر دو ہوں گی تو دونوں اس میں شریک ہوں گی اگر ایک ہوگی تو چھٹا حصہ اس کو پورا مل جائے گا۔

(سہ ماہی امجدیہ گھوسی: ص۲۴، جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء)

مذکورہ آیات اور احادیث میں جس وضاحت کے ساتھ میت کے ورثے کے حالات بیان کئے گئے ہیں وہ صرف اور صرف اسلام ہی کا حصہ ہے۔ دنیا کے کسی بھی مذہب میں اس کی ادنیٰ مثال ملنی مشکل ہی نہیں محال بھی ہے۔

بڑا افسوس ہوتا ہے ان پر جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا اس نے مرد کو عورت کا دوگنا حصہ دیا ہے جبکہ تقاضۂ عدل تو یہ تھا کہ دونوں کو برابر حصہ ملے کیونکہ دونوں آدم کی اولاد ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اسلام نے وراثت میں عورتوں کو حصے داری کا مستحق بنا کر ان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے اور جہاں تک بات رہی عدل و مساوات کی تو اگر انصاف کی عینک سے دیکھا جائے تو ترکے میں عورتوں کو یہ حق بھی نہیں ملنا چاہیے کیونکہ عورت پیدائش سے لے کر موت تک مرد ہی کی ذمے داری میں ہوتی ہے اس لیے کہ جب وہ شادی کے بندھن سے آزاد رہتی ہے تو اپنے باپ کی کفالت میں ہر طرح کی معاشی سوچ و فکر سے بے نیاز رہتی ہے پھر جب وہ شادی کے رشتے سے منسلک ہو جاتی ہے تو اس کے نان و نفقہ کا سارا بوجھ اس کے شوہر کے سر ہوتا ہے اور یہاں بھی معاشی فکر سے بے نیاز رہتی ہے مگر اس کے باوجود اگر اسلام نے اس کو میت کے ترکے میں حصہ دیا ہے تو اس پر یہ اسلام کا احسان نہیں تو اور کیا ہے؟ سب سے پہلے خود معترض کو اپنے مذہبی دامن میں جھانکنا چاہیے کہ ان کے یہاں عورتوں کے حقوق اور اس تعلق سے ان کا کیا نظریہ ہے۔ ان کو اسلام کی یہ اعلیٰ ظرفی نظر نہیں آتی کہ اس نے میت کے ورثے میں صرف چار مرد کو حصے داری کا مستحق قرار دیا جبکہ اس کے مقابلے آٹھ عورتوں کو اس کا حق دیا ہے جو مرد کا دوگنا ہے۔

احکام تقسیم میراث:

میّت کے متروکہ اموال میں حکم میراث جاری کرنے سے قبل ان چیزوں کا خاص دھیان رکھنا ضروری ہے۔ (۱) میت کے اوپر کسی کا قرض تو نہیں اگر ہے تو پہلے اس کے مال سے قرض کی ادائیگی کی جائے گی۔ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وصیت سے قرض ادا کرنے کا حکم دیا (دارمی) (۲) میت نے کسی کے لیے وصیت تو نہیں کی ہے۔ اگر کسی کے لیے میت نے وصیت کی ہے تو اس کے مقدار مال کو متعلقہ فرد کو دے دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ وصیت کردہ مال کی مقدار تہائی سے زائد نہ ہو اگر اس سے زیادہ ہو تو بھی تہائی ۱/۳ ہی دیا جائے گا خیال رہے کہ موصی لہ کا تعلق ذوی الفروض سے نہ ہو۔ (۳) میت کی تجہیز و تکفین اس کے مال سے کی جائے گی۔ اس کے بعد جو مال باقی بچے گا اس میں احکام میراث جاری ہوں گے۔ □□

بقیہ: محرم کی رسمیں اور ان کے شرعی احکام

اور قصداً غم آوری و غم پروری خلافِ رضا ہے۔ جسے اس کا غم نہ ہو اُسے بے غم نہ رہنا چاہیے، بلکہ اس غم نہ ہونے کا غم چاہیے کہ اُس کی محبت ناقص ہے اور جس کی محبت ناقص اس کا ایمان ناقص۔ (فتاویٰ رضویہ، ج:۹، قسط:۲، ص:۱۳۸)

یہ ہے سچی محبت اور غم کا فلسفہ جسے ہر مومن کو ملحوظ رکھنا چاہیے ورنہ ایمان پر خطرہ ہے۔

یہ محرم الحرام کے مبارک ماہ میں بدعات و خرافات کے خلاف امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ کا قلمی جہاد ہے۔ اسے وہ لوگ بھی پڑھیں اور حقیقت کا اعتراف کریں جو امام احمد رضا قدس سرہٗ کے بارے میں غلط فہمیوں کے شکار ہیں اور اس مجدد برحق کے خلاف غلط پروپیگنڈے بھی کرتے ہیں۔ کیسی سچی، سیدھی باتیں اس امام برحق نے کہی ہیں، ان کو بار بار پڑھنا چاہیے اور اس کے مطابق عمل بھی کرنا چاہیے۔ یوں ہی ان فتاویٰ و ارشادات سے ہمارے وہ سنی بھائی بھی سبق لیں جو محرم الحرام کی خرافات میں ملوث ہیں اور روافض کے طریقوں پر چل رہے ہیں، انھیں چاہیے کہ مسلک اہلِ سنت و جماعت پر کاربند ہوں غلط رسوم کو یکسر چھوڑ دیں کہ اسی میں بھلائی اور دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔ □□

مولانا محمد عبدالمبین نعمانی ☆

محرم کی رسمیں اور ان کے شرعی احکام

محرم کا مہینہ بڑا مبارک اور محترم مہینہ ہے۔ اسلامی سال کا یہ پہلا مہینہ اپنے اندر بڑی عظیم یادگاریں رکھتا ہے۔ اس کی دسویں تاریخ، جس کو یوم عاشورا کہتے ہیں، بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ محرم ہی کی دسویں تاریخ جمعہ کے دن حضرت نوح علیہ السلام اپنی کشتی سے زمین پر تشریف لائے اور اسی دن دسویں تاریخ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے ظلم سے نجات پائی جبکہ فرعون غرق ہو گیا، اسی دسویں محرم اور جمعہ کے دن قیامت آنے والی ہے۔ ۶۱ ہجری دسویں محرم جمعہ کے دن ہی شہزادۂ رسول، جگر گوشۂ بتول اور گلشن اسلام کے مہکتے پھول حضرت سیّدنا امام عالی مقام حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کربلا کی تپتی ہوئی سرزمین پر شہادت کا جام پیا۔ اسی لیے جب ہر سال یہ تاریخ آتی ہے، محبانِ اہل بیت اس دل دوز واقعے کو یاد کر کے غم و اندوہ میں ڈوب جاتے ہیں۔ طبعی طور سے اگر واقعات کربلا سن کر یا یاد کر کے غم تازہ ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ قصداً سوگ منانا، ماتم و نوحہ کی فضا قائم کرنا اور سینہ کوبی کرنا کسی طرح شرعاً نہیں۔ ہو سکے تو نویں دسویں دن روزہ رکھ کر اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کریں، صدقہ و خیرات کریں، شہدائے کربلا و دیگر صحابہ و اہلِ بیت کو ایصال ثواب کریں۔ اہلِ بیت کے فضائل کی مجالس قائم کریں اور سچے واقعاتِ کربلا بیان کریں اور سنیں، کہ باعثِ برکت و موجبِ عبرت ہے۔

امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہٗ کے خلیفہ و تلمیذ صدر الشریعہ حضرت مولانا شاہ محمد امجد علی اعظمی قادری رضوی قدس سرہٗ مصنف بہار شریعت ارشاد فرماتے ہیں:

''ماہ محرم میں دس دنوں تک خصوصاً دسویں کو حضرت سیّدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ و دیگر شہدائے کربلا کو ایصالِ ثواب کرتے ہیں، کوئی شربت پر فاتحہ دلاتا ہے، کوئی شیر برنج پر، کوئی مٹھائی پر، کوئی روٹی گوشت پر۔ جس پر چاہو فاتحہ دلاؤ جائز ہے، ان کو جس طرح ایصالِ ثواب کرو مندوب (پسندیدہ) ہے۔ بہت سے (لوگ) پانی اور شربت کی سبیل لگاتے ہیں، جاڑوں میں چائے پلاتے ہیں، کوئی کھچڑا پکواتا ہے، جو کارِ خیر کرو اور ثواب پہنچاؤ، ہو سکتا ہے۔ ان سب کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ بعض جاہلوں میں مشہور ہے کہ محرم میں سوائے شہدائے کربلا کے دوسروں کی فاتحہ نہ دلائی جائے، ان کا یہ خیال غلط ہے، جس طرح دوسرے دنوں میں سب کی فاتحہ ہو سکتی ہے، ان دنوں میں بھی ہو سکتی ہے۔'' (بہارِ شریعت، حصہ ۱۶، ص: ۲۴۴-۲۴۵، قادری کتاب گھر، بریلی)

☆ المجمع الاسلامی، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

مجلسِ ذکرِ شہادت:

اعلیٰ حضرت سے سوال ہوا کہ بغیر ماتم و سینہ کوبی کے جو مرثیے صوفیہ کرام کے پڑھے جائیں ان کا کیا حکم ہے؟ تو ارشاد فرمایا:

جو مجلس ذکر شریف حضرت سیّدنا امام حسین و اہلِ بیت کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ہو جس میں روایات صحیحہ معتبرہ سے ان کے فضائل و مقامات و مدارج بیان کیے جائیں اور ماتم و تجدیدِ غم وغیرہ امور مخالفہ شرع سے یکسر پاک ہو، فی نفسہٖ حسن و محمود (اچھی اور خوب) ہے خواہ اس میں نثر پڑھیں یا نظم، اگرچہ وہ نظم بوجہ ایک مسدس ہونے کے جس میں ذکر حضرت سیّد الشہدا ہے عرفِ حال میں بنام مرثیہ موسوم ہو کہ اب یہ وہ مرثیہ نہیں جس کی نسبت ہے: نھٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن المراثی۔ (رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مرثیوں سے منع فرمایا) (فتاویٰ رضویہ جدید، ص: ۵۲۳، ج ۲۴، رسالہ تعزیہ داری، ص: ۱۶، رضا اکیڈمی ممبئی)

حضرت صدر الشریعہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمۃ والرضوان، ماہ محرم شریف کی مجالس کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''عشرۂ محرم میں مجلس منعقد کرنا اور واقعاتِ کربلا بیان کرنا جائز ہے، جبکہ روایاتِ صحیحہ بیان کی جائیں۔ ان واقعات میں صبر و تحمل، رضا و تسلیم کا بہت مکمل درس ہے اور پابندی احکامِ شریعت و اتباعِ سنت کا زبردست عملی ثبوت ہے کہ دینِ حق کی حفاظت میں تمام اعزہ و اقربا و رفقا اور خود اپنے کو راہِ خدا میں قربان کیا اور جزع و فزع کا نام بھی نہ آنے دیا۔ مگر اس مجلس میں فرق و امتیاز رہے۔'' (بہارِ شریعت، حصہ ۱۶، ص: ۲۴۷)

حضرت مفتیِ اعظم علامہ شاہ مصطفیٰ رضا نوری علیہ الرحمہ سے سوال ہوا کہ محرم شریف میں ذکر شہادتِ حضراتِ حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما صحیح روایتوں سے منعقد کرنا کیسا ہے؟ تو جواباً ارشاد فرمایا:

''بے شک، بے شبہ حضراتِ امامین سیدین شہیدین حسنینِ کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاک ذکرِ مبارک کی مجلسِ متبرک اہلِ سنت کا طریقۂ رضیہ رسمِ محمودِ مرضیہ ہے۔ محبوبانِ دینِ حبیبِ کبریا علیہ ثم علیہم التحیۃ والثنا کا ذکر مسلمانوں کے دین میں ذکرِ خدا ہی ہے کہ:

مردانِ خدا خدا نہ باشند ۔۔۔ لیکن ز خدا جدا نہ باشند

(خدا والے خدا نہیں ہوتے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے)

ظاہر ہے مسلمانوں کا ان محبوبانِ الٰہی سے علاقہ ان کی ذوات کے لیے نہیں بلکہ اسی لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بزرگانِ خاص، محبوبانِ اختصاص ہیں۔ ان کا ذکر وہ اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ بارگاہِ الٰہی کے خاص مقبول بندے ہیں۔ ان کا ذکر باعث رحمت و برکت اور کارِ ثواب ہے۔ ان کا ذکر خدا کی عبادت اور خدا چاہے تو سببِ نجات از عذاب ہے۔ امام سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں: ''عِنْدَ ذِکْرِ الصَّالِحِیْنَ تَنْزِلُ الرَّحْمَۃُ۔'' (نیکوں کے ذکر کے وقت رحمت نازل ہوتی ہے) اور خاص کر یہ ذکرِ شہادت تو ارشادِ الٰہی: ''وَذَکِّرْھُمْ بِاَیَّامِ اللّٰہِ۔'' اور انھیں اللہ کے دن یاد دلا۔ (سورہ ابراہیم: ۱۴/ ۵) کے نیچے داخل۔ اس ذکر سے مسلمانوں کا مقصد اپنے اماموں کی دینی عظمت دکھانا، حق پر استقامت اور باطل سے نفرت کی ضرورت بتانا۔ فسق و فجور کی عداوت اور اپنے ان دینی پیشواؤں کی محبت کو، جن سے ایمان کو قوت پہنچتی ہے۔ (بیان کر کے) اپنے دلوں کو تازہ کرنا اور دین و مذہب پر اپنی جان و مال اور عزت و آبرو سب کو نثار و قربان کر دینے کا سبق اپنے ان اماموں کے اس اسوۂ حسنہ سے حاصل کرنا، اوروں کو ان کی ہدایت کرنا، رغبت دلانا وغیرہ وغیرہ ہے۔ (فتاویٰ مصطفویہ، حصہ سوم، ص: ۱۶۵-۱۶۶، مکتبۂ رضا، بریلی)

تعزیہ داری:

دسویں محرم میں برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش میں یادگار امام حسین کے نام پر تعزیہ داری کی جو رسم جاری ہے وہ انتہائی غلط شکل اختیار کر گئی ہے۔ مقامات مقدسہ اور روضۂ امام عالی مقام کا محض صحیح نقشہ بنوا کر بطور یادگار رکھا جاتا تو اس میں کوئی حرج نہ تھا۔ جیسے کہ کعبہ معظّمہ اور روضۂ رسول کے نقشے ہم بناتے اور گھروں میں تبرکاً رکھتے ہیں۔ مگر افسوس، عقیدت کے غلو نے تعزیہ کو مایۂ بدعات بنا کر رکھ دیا۔ حتیٰ کہ اب تو روضۂ امام کا صحیح نقشہ بھی باقی نہ رہا۔ طرح طرح کی نئی تراش خراش نے تعزیہ کو ایک نئے نقشے میں تبدیل کر دیا ہے، لہٰذا اب حد سے تجاوز کی بنیاد پر اس کو کسی طرح جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں جو بے راہ رویاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

''تعزیہ داری کہ واقعات کربلا کے سلسلے میں طرح طرح کے ڈھانچے بناتے اور ان کو حضرت سیّدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روضۂ پاک کی شبیہ کہتے ہیں۔ کہیں تخت بنائے جاتے ہیں، کہیں ضریح (قبر) بنتی ہے اور علم اور شدّے نکالے جاتے ہیں۔ ڈھول تاشے اور قسم قسم کے باجے بجائے جاتے ہیں۔ تعزیوں کا بہت دھوم دھام سے گشت ہوتا ہے۔ آگے پیچھے ہونے میں جاہلیت کے سے جھگڑے ہوتے ہیں، کبھی درخت کی شاخیں کاٹی جاتی ہیں، کہیں چبوترے کھدوا دیے جاتے ہیں۔ تعزیوں سے منّتیں مانی جاتی ہیں، سونے چاندی کے علم چڑھائے جاتے ہیں، ہار پھول ناریل چڑھاتے ہیں، وہاں جوتے پہن کر جانے کو گناہ جانتے ہیں، بلکہ اس شدت سے منع کرتے ہیں کہ گناہ پر بھی ایسی ممانعت نہیں کرتے۔ چھتری لگانے کو بہت برا جانتے ہیں۔ تعزیوں کے اندر دو مصنوعی قبریں بناتے ہیں، ایک پر سبز غلاف اور دوسری پر سرخ غلاف ڈالتے ہیں، سبز غلاف والی کو حضرت سیّدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر اور سرخ غلاف والی کو حضرت سیّدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر یا شبیہ قبر بتاتے ہیں اور وہاں شربت، مالیدہ وغیرہ پر فاتحہ دلواتے ہیں۔ یہ تصور کر کے کہ حضرت امام عالی مقام کے روضہ اور مواجہہ اقدس میں فاتحہ دلا رہے ہیں، پھر یہ تعزیہ دسویں تاریخ کو مصنوعی کربلا میں لے جا کر دفن کرتے ہیں۔ گویا یہ جنازہ تھا جسے دفن کر آئے، پھر تیجہ، دسواں، چالیسواں سب کچھ کیا جاتا ہے اور ہر ایک خرافات پر مشتمل ہوتا ہے۔

حضرت قاسم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مہندی نکالتے ہیں گویا ان کی شادی ہو رہی ہے اور مہندی رچائی جائے گی۔

اور اس تعزیہ داری کے سلسلے میں کوئی پیک بنتا ہے جس کے کمر سے گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں گویا حضرت امام عالی مقام کا قاصد اور ہرکارہ ہے جو یہاں سے خط لے کر ابن زیاد یا یزید کے پاس جائے گا، وہ ہرکاروں کی طرح بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔

کسی بچے کو فقیر بنایا جاتا ہے، اس کے گلے میں جھولی ڈالتے اور گھر گھر اس سے بھیک منگواتے ہیں۔

کوئی سقہ (بھشتی) بنایا جاتا ہے۔ چھوٹی سی مشک اس کے کندھے سے لٹکتی ہے، گویا یہ دریائے فرات سے پانی بھر کر لائے گا۔ کسی علم پر مشک لٹکتی ہے اور اس میں تیر لگا ہوتا ہے۔ یہ حضرت عباس علم بردار ہیں کہ فرات سے پانی لا رہے ہیں اور یزیدیوں نے مشک کو تیر سے چھید دیا ہے۔ اس قسم کی بہت سی باتیں کی جاتی ہیں، یہ سب لغو و خرافات ہیں۔ ان سے ہرگز سیّدنا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ خوش نہیں ہوں گے۔

تم خود غور کرو کہ انھوں نے احیائے دین وسنت کے لیے یہ زبردست قربانیاں دیں اور تم نے معاذ اللہ اس کو بدعات کا ذریعہ بنالیا۔ بعض جگہ اس تعزیہ داری کے سلسلے میں براق بنایا جاتا ہے، جو عجیب قسم کا مجسمہ ہوتا ہے کہ کچھ حصہ انسانی شکل کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ جانور کا سا، شاید یہ حضرت امام عالی مقام کی سواری کے لیے ایک جانور ہوگا۔ کہیں دلدل بنتا ہے کہیں بڑی بڑی قبریں بنتی ہیں۔ بعض جگہ آدمی ریچھ، بندر، لنگور بنتے ہیں اور کودتے پھرتے ہیں، جن کو اسلام تو اسلام انسانی تہذیب بھی جائز نہیں رکھتی، ایسی بری حرکت کو اسلام ہرگز جائز نہیں رکھتا۔ افسوس! کہ محبت اہل بیت کرام کا دعویٰ اور ایسی بے جا حرکتیں۔ یہ واقعہ تمھارے لیے نصیحت تھا اور تم نے اس کو کھیل تماشا بنالیا۔ اسی سلسلے میں نوحہ و

ماتم بھی ہوتا ہے اور سینہ کوبی ہوتی ہے۔ اتنے زور زور سے سینہ کوٹتے ہیں کہ ورم ہوجاتا ہے، سینہ سرخ ہوجاتا ہے بلکہ بعض جگہ زنجیروں اور چھریوں سے ماتم کرتے ہیں کہ سینے سے خون بہنے لگتا ہے۔

تعزیوں کے پاس مرثیہ پڑھا جاتا ہے اور تعزیہ جب گشت کو نکلتا ہے اس وقت بھی اس کے آگے مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔ مرثیہ میں غلط واقعات نظم کیے جاتے ہیں۔ اہلِ بیت کرام کی بے حرمتی اور بے صبری اور جزع فزع کا ذکر کیا جاتا ہے اور چونکہ اکثر مرثیے رافضیوں کے ہی ہیں، بعض میں تبرا بھی ہوتا ہے، مگر اس رو میں سنی بھی بے تکلف پڑھ جاتے ہیں اور انھیں اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ یہ سب ناجائز اور گناہ کے کام ہیں۔

اظہارِ غم کے لیے سر کے بال بکھیرتے ہیں، کپڑے پھاڑتے اور سر پر خاک ڈالتے اور بھوسا اُڑاتے ہیں۔ یہ بھی ناجائز اور جاہلیت کے کام ہیں۔ ان سے بچنا نہایت ضروری ہے احادیث میں ان سب کی ممانعت آئی ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایسے امور سے پرہیز کریں اور ایسے کام کریں جن سے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہوں کہ یہی نجات کا راستہ ہے۔

تعزیہ اور علم کے ساتھ بعض لوگ لٹاتے ہیں۔ یعنی روٹیاں یا بسکٹ یا اور کوئی چیز اونچی جگہ سے پھینکتے ہیں۔ یہ ناجائز ہے کہ رزق کی سخت بے حرمتی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں کبھی نالیوں میں بھی گرتی ہیں اور اکثر لوٹنے والوں کے پاؤں کے نیچے بھی آتی ہیں اور بہت کچھ کچل کر ضائع ہوتی ہیں۔ اگر یہ چیزیں انسانیت کے طریق پر فقرا کو تقسیم کی جائیں تو بے حرمتی بھی نہ ہو اور جن کو دیا جائے انھیں فائدہ بھی پہنچے مگر وہ لوگ اس طرح لٹانے ہی کو اپنے نامی تصور کرتے ہیں۔ (بہارِ شریعت، حصہ ۱۶، ص: ۲۴۸، قادری کتاب گھر، بریلی)

دیکھا آپ نے بارگاہِ رضا کے اس فیض یافتہ نے کیسا بے باک قلم چلایا اور دو ٹوک فیصلہ سنایا ہے۔ نہ اپنوں کی پروا کی ہے نہ غیروں کا خوف کھایا ہے۔ سچے عالمِ دین کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ اب ذرا امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے ارشادات و فتاویٰ بھی تعزیہ و متعلقات تعزیہ کے بارے میں ملاحظہ کریں کہ وہ دردمند ملت، قوم کی فلاح و بہبود اور اصلاح کے لیے کیا کیا اقدام کرتے اور بدعات و خرافات پر کیسی کاری ضرب لگاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''تعزیہ کی اصل اس قدر تھی کہ روضہ پُرنور حضور شہزادۂ گل گوں قبا حسین شہیدِ ظلم و جفا صلوٰتُ اللّٰہِ تَعَالیٰ وَسَلَامُہٗ عَلٰی جَدِّہِ الْکَرِیْمِ وَ عَلَیْہِ کی صحیح نقل بنا کر بہ نیت تبرک، مکان میں رکھنا، اس میں شرعاً کوئی حرج نہ تھا کہ تصویر، مکانات وغیرہ ہر غیر جان دار کی بنانا رکھنا سب جائز۔ اور ایسی چیزیں کہ معظمانِ دین کی طرف منسوب ہوکر عظمت پیدا کریں ان کی تمثال (شکل) بہ نیت تبرک پاس رکھنا قطعاً جائز، جیسے صدہا سال سے طبقۃً فطبقۃً (یکے بعد دیگرے) ائمۂ دین و علمائے معتمدین نعلین شریف حضور سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشے بناتے اور ان کے فوائد جلیلہ و منافع جزیلہ میں مستقل رسالے تصنیف فرمائے ہیں، جسے اشتباہ (شبہ) ہو امام علامہ تلمسانی کی 'فتح المتعال' وغیرہ مطالعہ کرے۔ مگر جہالِ بے خرد (بے عقل جاہلوں) نے اس اصل جائز کو بالکل نیست و نابود کر کے صدہا خرافات وہ تراشیں کہ شریعت مطہرہ سے الامان الامان کی صدائیں آئیں۔ اوّل تو نفس تعزیہ میں روضۂ مبارک کی نقل ملحوظ نہ رہی، ہر جگہ نئی تراش، نئی گڑھت، جسے اس نقل سے کچھ علاقہ نہ نسبت، پھر کسی میں پریاں، کسی میں براق کسی میں اور بے ہودہ طمطراق (دھوم دھام) پھر کوچہ بہ کوچہ، دشت بہ دشت، اشاعت غم کے لیے ان کا گشت اور ان کے گرد سینہ زنی اور ماتم سازی کی شورافگنی۔ کوئی ان تصویروں کو جھک جھک کر سلام کر رہا ہے، کوئی مشغولِ طواف، کوئی سجدے میں گرا ہے، کوئی ان مایۂ بدعات (سامان بدعات) کو معاذ اللہ جلوہ گاہ حضرت امام عَلٰی جَدِّہٖ وَ عَلَیْہِ الصّلاۃ والسَّلام سمجھ کر اس اَبرک پنّی سے مرادیں مانگتا، منتیں مانتا ہے، حاجت روا جانتا ہے۔ پھر باقی، تماشے، باجے، تاشے، مردوں عورتوں کا راتوں کو میل (اختلاط) اور طرح طرح کے بے ہودہ کھیل ان سب پر طرّہ ہیں۔ غرض عشرۂ محرم الحرام کہ اگلی شریعتوں سے اس شریعتِ پاک تک نہایت بابرکت و محل عبادت ٹھہرا ہوا تھا۔ ان بے ہودہ رسوم نے جاہلانہ اور فاسقانہ میلوں کا زمانہ کردیا۔ پھر وبالِ ابتداع (بدعت نکالنے کے وبال) کا وہ جوش ہوا کہ خیرات کو بھی بطور خیرات نہ رکھا۔ ریا و تفاخر علانیہ ہوتا ہے، پھر وہ بھی یہ نہیں کہ سیدھی طرح محتاجوں کو دیں بلکہ چھتوں پر بیٹھ کر پھینکیں گے، روٹیاں زمین پر گر رہی ہیں، رزق الٰہی کی بے ادبی ہوتی ہے، پیسے ریتے میں گر کر غائب ہوتے ہیں، مال کی اضاعت (بربادی) ہو رہی ہے مگر نام تو ہوگیا کہ فلاں صاحب لنگر لٹا رہے ہیں۔

اب بہارِ عشرہ کے پھول کھلے، تاشے باجے بجتے چلے، طرح طرح کے کھیلوں کی دھوم، بازاری عورتوں کا ہر طرف ہجوم، شہوانی میلوں کی پوری رسوم، جشن یہ کچھ اور اس کے ساتھ خیال وہ کچھ کہ گویا یہ ساختہ تصویریں بعینہا حضراتِ شہدائے کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے جنازے ہیں۔ (پھر) کچھ نوچ اُتار، باقی توڑ تاڑ دفن کردیئے۔ یہ ہر سال اضاعت مال (مال ضائع کرنے) کے جرم و وبال جداگانہ رہے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ، حضرات شہدائے کربلا علیہم الرّضوان والثّنا کا، ہمارے بھائیوں کو نیکیوں کی توفیق بخشے اور بری باتوں سے توبہ عطا فرمائے۔ آمین۔

اب کہ تعزیہ داری اس طریقۂ نامرضیہ (ناپسندیدہ) کا نام ہے، قطعاً بدعت

ونا جائز وحرام ہے۔ہاں!اگراہلِ اسلام صرف جائز طور پر حضرات شہدائے کرام عَـلَيهِـمُ الـرّضوانُ التام کی ارواحِ طیبہ کوایصالِ ثواب کی سعادت پر اقتصار (اکتفا) کرتے تو کس قدر خوب ومحبوب تھا۔اوراگرنظرشوق ومحبت میں نقل روضۂ انور کی بھی حاجت تھی تو اسی قدر جائز پر قناعت کرتے کہ صحیح نقل بغرض تبرک و زیارت اپنے مکانوں میں رکھتے اوراشاعتِ غم وتصنع الم ونوحہ زنی و ماتم کنی و دیگر امورشنیعہ و بدعات قبیحہ سے بچتے۔اس قدر میں بھی کوئی حرج نہ تھا۔مگراب اس نقل میں بھی اہلِ بدعت سے ایک مشابہت اورتعزیہ داری کی تہمت کا خدشہ اور آئندہ اپنی اولاد یا اہل اعتقاد (عقیدت مندوں) کے لیے ابتلائے بدعات (بدعات میں مبتلا ہونے) کا اندیشہ ہےاورحدیث میں آیا:''اِتَّـقُـوْا مَـوَاضِعَ التُّهَمِ.'' (تہمت کی جگہوں سے بچو)اوروارد ہوا:''مَـنْ كَـانَ يُـؤْمِنُ بِـاللّٰـهِ وَالْيَـوْمِ الْاٰخِـرِ فَـلَايَقِفن مَوَاقِفَ التُّهَمِ.'' (جواللہ اورقیامت کےدن پر ایمان رکھتا ہےاس کو چاہیے کہ تہمت کی جگہوں پر کھڑا بھی نہ ہو)لہٰذا روضۂ اقدس حضورسیّدالشہدا کی ایسی تصویربھی نہ بنائے بلکہ صرف کاغذ کے صحیح نقشے پرقناعت کرےاوراسے بقصدِ تبرک بے آمیزشِ منہیات (ممنوع کاموں کی آمیزش کے بغیر) اپنے پاس رکھے،جس طرح حرمین محترمین سے کعبۂ معظّمہ اورروضۂ عالیہ کے نقشے آتے ہیں، یادلائل الخیرات شریف میں قبور پرنور کے نقشے لکھے ہیں۔'' (فتاویٰ رضویہ،ج۹،قسط:۱،ص:۳۵-۳۶،رضااکیڈمی،ممبئی)

عاشورہ کا روزہ:

ماہِ محرم خاص کر دسویں محرم میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے امام احمد رضا قدس سرہٗ اپنے فتاویٰ میں ارشادفرماتے ہیں:

مسلمانوں کوان ایام میں صدقات وخیرات،مبرات وحسنات (نیکیوں) کی کثرت چاہیے۔خصوصاً روز عاشورہ کا کہ سال بھر کے روزوں کا ثواب اورایک سالِ گزشتہ کے گناہوں کی معافی ہے۔کما ثبت فی الحدیث الصحیح۔ (جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے)اوربہتر یہ ہے کہ نویں ودسویں دونوں کا روزہ رکھے۔

بـقـولـه صـلّـى الـلّـه تـعالىٰ عليه وسلم: لَئِنْ عِشْتُ اِلىٰ قَابِلٍ لاصُـومَـنَّ الـتَّـاسِعَ. (حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی بنیاد پر کہ فرمایا:اگرمیں آئندہ باحیات رہا تو ضرورنویں کوبھی روزہ رکھوں گا)

صدقه و ایصالِ ثواب:

حضرت شہزادۂ گلگوں قبا امام حسین شہید کربلا و دیگر شہدائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نام پاک پرجس قدر ہوسکے تصدق وایصال ثواب کریں بلکہ اُن روزوں وغیرہا تمام حسنات کا ثواب اسی جناب گردوں قُباب کی نذر کریں۔

گرمیوں میں ان کے نام پرشربت پلائیں،جاڑے میں چائے پلائیں اورنیک نیت، پاک مال سے شربت چائے کھانے کو جتنا چاہیں لذیذ وبیش قیمت کریں،سب خیر (نیکی) ہے۔کھچڑا پلاؤ،فرنی جو چاہیں اور بروقت میسر ہو برادری میں بانٹیں، محتاجوں کوکھلائیں،اپنے گھر والوں کوکھلائیں،نیک نیت سے سب ثواب ہے۔

کـمـا ثبت فى الاحاديث الصحاح حتى قال صلى اللّٰه تعالىٰ عـلـيـه وسـلـم: ومـا اطعمت نفسک فهولک صدَقَةٌ. (جیسا کہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہےاورسرکاراقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا،جو تواپنے کوکھلائے وہ بھی تیرے لیےصدقہ ہے)

رہا یہ کہ کھچڑا کہاں سے ثابت ہوا، جہاں سے شادی کا پلاؤ،دعوت کا زردہ ثابت ہوا۔یہ تخصیصات،عرفیہ ہیں (یعنی لوگوں میں معروف ومروج ہیں) نہ شرعیہ (یعنی خاص ان چیزوں کا شریعت نےحکم نہیں دیامگرمنع بھی نہ کیا)ہاں جو اسےشرعاًضروری جانے وہ باطل پر ہے۔

روٹیاں پکا کرتقسیم کرنا بھی خیر ہے،مگرپھینکنا منع ہےاوران کا پاؤں کے نیچے آنا یاناپاک جگہ گرناسخت شدیدمواخذے کا موجب۔ایک تو روٹی کی بےحرمتی جس کی تعظیم کاحدیث میں حکم فرمایا،دوسرے نیاز کی چیز کی بےتوقیری (بےادبی)۔ نیاز کی چیزمعظم (قابلِ تعظیم)ہوتی ہے۔كـمـا دل حديث نفيس فى بهجة الاسرار. (جیسا کہ بہجۃ الاسرارکی ایک حدیث نفیس سے پتہ چلتا ہے)

بےادب وہابیوں کا کہنا کہ اس میں توصدقہ کےسبب سےاورخباثت آگئی، ان کی قلبی خباثت ہے کہ محبوبانِ خداکےنام سےانھیں عداوت ہے۔

بهشتی بننا:

اگر بدعات سے خالی ہواورمحض نام ونقل نہ ہو بلکہ کام اورفعل ہویعنی پانی بھربھرکرمسلمانوں کو پلائیں، وضوکرائیں،توضروراچھا کام ہے اور باعث اجر ہےاوراس کا ثواب بھی نذرشہدائے کرام ہوسکتا ہے۔

اور پیک بننا:نری نقالی اور بےہودہ وبےمعنی ہے۔

فقیربننا:یوں ہی فقیربن کر بلاضرورت ومجبوری بھیک مانگنا حرام۔کـمـا نـطـقـت به احاديث مستفيضة. (جیسا کہ احادیث مشہورہ بتاتی ہیں)اور ایسوں کودینا بھی حرام۔لانـــه اعـــانـة عـــلــى الــمـعـصية كـمـا فى الدرالمختار. (اس لیے کہ یہ گناہ پرمدد کرنا ہےجیسا کہ درمختار میں ہے)

اور (پیک بننے کی) وہ منت ماننی کہ دس برس تک ایسا کریں گے،سب مہمل ممنوع ہے۔قـال صـلـى الـلّٰـه تـعـالىٰ عليـه وسلم: لانذرَ فى معصية. (گناہ کےکام میں نذرنہیں)

استمداد و استعانت:

ہاں سیّدناامام عالی مقام علـى جـده الـكـريـم ثـم عـلـيـه الصلاة

والتسلیم سے اپنی حاجت میں استمد ادواستعانت، وطلب دعاوشفاعت جائز و محبوب۔قال اللّٰہ تعالٰی (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ. (اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو) (کنزالایمان، سورہ مائدہ: ۳۵)

وقال اللّٰہ تعالٰی (اوراللہ تعالیٰ نے فرمایا)

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّھِمُ الْوَسِیْلَۃَ. (وہ مقبول بندے جنھیں یہ کافر پوجتے ہیں، وہ آپ ہی اپنے رب کی طرف وسیلے ڈھونڈتے ہیں) (کنزالایمان، سورہ اسراء: ۱۷/ ۵۷)

دھنیا:

دھنیا بنانے کھانے، بٹوؤں میں رکھ کر بچوں کو بھیجنے میں فی نفسہٖ کچھ حرج نہ تھا مگر وہ مبنی (بنیاد) جس کی بنا پر یہ کیا جاتا ہے، شرعاً ناجائز ہے۔ اس کی اصل یوں ہے کہ پان کھانے کے عادی ہیں۔ محرم کے عشرہ میں سوگ کے خیال سے پان چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی جگہ پر دھنیا ایجاد ہوا ہے۔ شریعت نے عورت کو شوہر کی موت پر چار مہینے دس دن سوگ کا حکم دیا ہے۔ اوروں کی موت کے تیسرے دن تک اجازت دی ہے۔ باقی حرام ہے اور ہر سال سوگ کی تجدید تو کسی کے لیے اصلاً حلال نہیں۔ پھر حقیقت دیکھئے تو دعوائے غم بھی جھوٹا۔ غم میں آدمی سے پان نہ کھایا جائے تو دھنیے کے یہ تکلفات کہ وقت میں اس سے سوجگہ زائد اور خرچ بھی زیادہ اور لذت بھی افزوں (بڑھ کر) یہ ضرور ہوسکیں گے۔

سبز سرخ کپڑے:

یوں ہی عشرۂ محرم کے سبز رنگے ہوئے کپڑے بھی ناجائز ہیں۔ یہ بھی سوگ کی غرض سے ہیں۔ سوگ میں اصل سیاہ لباس ہے، وہ تو رافضیوں نے لیا اور انھیں زیبا بھی تھا کہ ایک تو ان کے دلوں کی بھی یہی رنگت ہے، دوسرے یہ کہ سیّدنا امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: الشیعۃ نساء ھذہ الامۃ. (شیعہ اس امت کی عورتیں ہیں) سوگ و ماتم عورتوں ہی کو خوب آتے ہیں۔ ہمارے جاہل سنی بھائی سیاہی سے تو بچے کہ رافضیوں کی مشابہت نہ ہو مگر اس سے قریب تر رنگت سبزی پائی اسے اختیار کیا۔ سبزی جب گہری ہوگی سیاہی لے آئے گی، ہلکی سیاہی کو سبزی کہتے ہیں۔ آسمان نیلا ہے اسے عربی میں خضراء فارسی میں چرخِ سبزہ فام کہتے ہیں، اُردو میں مسیں بھیگنے کو کہ اس وقت بالوں کی سیاہی خوب گہری نہیں ہوتی سبزہ آغاز کہتے ہیں۔ لہٰذا اس نیت سے یہ بھی ناجائز ہے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ عشرۂ مبارک میں تین رنگوں سے بچیں، سیاہ، سبز، سرخ۔ سیاہ و سبز کی وجہیں تو معلوم ہوگئیں اور سرخ آج کل ناصبی خبیث (خارجی) خوشی کی نیت سے پہنتے ہیں۔ سیاہ میں اودا، نیلا، کاسنی، سبز میں دھانی، کاہی، پستئی، سرخ میں گلابی، نارنجی، عنابی۔ سب داخل ہیں۔ غرض جس پر ان میں کوئی رنگ صادق آئے، اگر سوگ یا خوشی کی نیت سے پہنے جب تو خود ہی حرام ہے، ورنہ ان کی مشابہت سے بچنا بہتر ہے۔

مرثیہ: یوں ہی مرثیے کہ رائج ہیں، سب حرام و ناجائز ہیں۔ حدیث میں ہے: نھٰی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عَنِ الْمَرَاثِی. (رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مرثیوں سے منع فرمایا)

ماتم: اور ماتم کرنا، چھاتی پیٹنا بھی حرام ہے۔ نطقت بتحریمہ احادیث بالغۃ حدالاشتھار. (اس کی حرمت پر ایسی حدیثیں ناطق ہیں جو حد شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں)

حَسَّن، حُسَّن بہ تشدید کہنا تو جہالت ہی تھا مگر ماتم سخت منع ہے۔

علم، تعزیے اور باجے وغیرہ:

یوں ہی علم، تخت، جریدے، باجے، کھیل تماشے سب بے ہودہ و بدعت و ممنوع ہیں۔ یوں ہی تعزیہ چڑھاوا، امام باڑے کا مکان، اس کی نوبت، روشنی، آرائش سب بشرح صدر ہیں۔ (سب کا حکم حسن سابق ہے)

غم والم کا نام اور لہو ولعب کی یہ دھوم دھام اور اس پر اُمید خوشنودیِ حضرتِ امام اور اس الٹی مت کا کیا ٹھکانا کہ یہ تو تعزیہ کی وہ تعظیم کہ گویا معاذ اللہ بعینہٖ یہی نعش مبارک حضور پرنور امام عالی مقام ہے، بلکہ اُس سے بھی زائد۔ یہاں تک کہ اسے سجدہ کرنے سے بھی باک (خوف) نہیں۔ اور کہاں یہ حرکت کہ کہار بیلدار وغیرہم کفار اسے اٹھائے پھریں اور اس پر پڑھا یہ جائے کہ ''اے مومنو! اٹھاؤ جنازہ حسین کا'' استغفر اللّٰہ.

پھر گلی کوچوں میں گشت، پھر توڑ تاڑ کر دبا دینا، کتنی شتر گُربگی (بے تکا پن) ہے۔ پھر مصنوعی کربلا میں جسے حقیقی کے مثل ٹھہراتے ہیں کوئی دقیقہ لغویات و ممنوعات کا اٹھا نہیں رکھتے۔

خلاصۂ کلام:

کہاں امام عالی مقام کی طرف نسبت اور کہاں یہ سخت شنیع حرکت۔ کاش اللہ عزوجل ہمارے بھائیوں کو سمجھ دیتا کہ ہزاروں روپے جو یوں نیکی برباد گناہ لازم میں تباہ کرتے، انھیں حضرات شہیدانِ پاک کے نام پر تصدق کرتے، مساکین کو دیتے، جاڑے میں اون کے لحاف، رضائی، گرم کپڑے بناتے۔ وغیرہ وغیرہ افعال حسنہ (نیک کام) کرتے تو کتنا بہتر ہوتا۔ اللہ ہدایت دے۔ آمین۔ (فتاویٰ رضویہ، ج: ۹ قسط: ۲، ص: ۳۶-۳۷ رضا اکیڈمی ممبئی)

غم منانا اور مروّجہ شہادت نامے پڑھنا:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ سے سوال ہوا کہ محفل میلاد شریف میں شہادت نامہ پڑھنا کیسا ہے، تو اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

شہادت نامہ نظم یہ نثر جو آج کل عوام میں رائج ہیں اکثر روایات باطلہ اور بے سروپا سے مملو (بھرے ہوئے) اور اکاذیب موضوعہ (گڑھے جھوٹوں) پرمشتمل ہیں۔ایسے بیان کا پڑھنا،سننا،وہ شہادت نامہ ہو یا کچھ اور مجلسِ میلاد مبارک میں ہوخواہ کہیں اور، مطلقاً حرام و ناجائز ہے۔خصوصاً جبکہ وہ بیان ایسے خرافات کو متضمّن ہو جس سے عوام کے عقائد میں زلل (لغزش) آئے کہ پھر تو اور بھی زیادہ زہرِ قاتل ہے۔ایسے ہی وجوہ پر نظر فرما کر حجۃ الاسلام امام محمد غزالی قدس سرہٗ وغیرہ ائمۂ کرام نے حکم فرمایا کہ شہادت نامہ پڑھنا حرام ہے۔

یوں ہی جبکہ اس سے مقصود، غم پروری وتصنع حزن (غم کی بناوٹ) ہو تو یہ نیت بھی شرعاً نامحمود (ناپسندیدہ) شرع مطہر نے غم میں صبر وتسلیم اور غم موجود کو حتی المقدور دل سے دور کرنے کا حکم دیا ہے، نہ کہ غم مدوم (وہ غم جو بروقت موجود نہ ہو) بہ تکلیف وزور لانا، نہ کہ بہ تصنع وزور بنانا، نہ کہ اسے باعثِ قربت وثواب ٹھہرانا۔یہ سب بدعات شنیعۂ روافض (رافضیوں کی بری ایجادات) ہیں،جن سے سنی کو احتراز (بچنا) لازم۔

ماشاءاللہ!اس میں کوئی خوبی ہوتی تو حضور پرنور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اقدس کی غم پروری سب سے زیادہ اہم وضروری ہوتی۔دیکھو حضور اقدس صلوات اللّٰہ تعالیٰ وسلامہ علیہ وعلی آلہٖ کا ماہ ولادت وماہ وفات وہی ماہ مبارک ربیع الاوّل شریف ہے، پھر علمائے امت وحامیان سنت نے اسے ماتمِ وفات نہ ٹھہرایا، بلکہ موسم شادی ولادت اقدس بنایا۔

ایاہ ثم ایاہ ان یشغلہ (ای یوم عاشوراء) ببدع الرافضۃ و نحوھم من الندب والنیاحۃ الحزن اذلیس ذلک من اخلاق المؤمنین والاکان یوم وفاتہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم اولیٰ بذالک واجریٰ.

(بچو بچو اس بات سے کہ عاشورہ کے دن روافض وغیرہم کی بدعات میں کوئی مشغول ہو مثلاً چیخ پکار اور نوحہ وغم پروری میں مشغولیت اختیار کرے، اس لیے کہ یہ مسلمانوں کے طریقے نہیں ورنہ سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یومِ وفات کے لیے زیادہ اولیٰ اور لائق ہوتا)

ایسے ہی ذکر شہادت کو امام حجۃ الاسلام وغیرہ علمائے کرام منع فرماتے ہیں۔**کَمَا ذَکَرَہُ الْاِمَامُ ابْنُ حَجَرِ الْمَکی فی الصواعق المحرقۃ.** جیسا کہ امام ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں ذکر فرمایا)

ہاں اگر صحیح روایات بیان کی جائیں اور کوئی کلمہ کسی نبی یا ملک (فرشتہ) یا صحابی کی توہینِ شان کا مبالغۂ مدح وغیرہ میں مذکور نہ ہو، نہ وہاں نوحہ یا سینہ کوبی یا گریبان دری (گریبان پھاڑنا) یا ماتم یا تصنع یا تجدید غم وغیرہ ممنوعات شرعیہ ہوں، تو ذکر شریف فضائل ومناقبِ حضرت سیّد امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بلاشبہ موجب ثواب ونزولِ رحمت ہے۔**عند ذکر الصالین تنزل الرحمۃ.** (نیکیوں کے ذکر کے وقت رحمت کا نزول ہوتا ہے) (فتاویٰ رضویہ ۹، قسط:۱،ص:۶۲-۶۳)

مجالس محرم اور غم پروری اور محفل میلاد میں ذکر شہادت سے متعلق امام احمد رضا قدس سرہٗ مزید ارشاد فرماتے ہیں:

عوام مجلس خواں اگر چہ بالفرض صرف روایات صحیحہ بروجہِ صحیح (ٹھیک ڈھنگ سے) پڑھیں بھی تاہم جواُن کے حال سے آگاہ ہے خوب جانتا ہے ذکر شہادت شریف پڑھنے سے اُن کا مطلب ہی بہ تصنع رونا، بہ تکلف رلانا اور اس رونے رُلانے سے رنگ جمانا ہے۔اس کی شناعت (قباحت) میں کیا شبہ ہے۔ہاں اگر خاص بہ نیت ذکر شریف حضرات اہل بیت طہارت **صلّی اللّٰہُ تعالیٰ علیٰ سَیّدِھِمْ وَعَلَیْھِمْ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ** ان کے فضائل جلیلہ ومناقب جمیلہ، روایاتِ صحیحہ سے بروجہِ صحیح بیان کرتے اور اس کے ضمن میں ان کے فضل جلیل، صبر جمیل کے اظہار کو ذکر شہادت مبارک بھی آجاتا اور غم پروری وماتم انگیزی کے انداز سے کامل احتراز ہوتا تو اس میں حرج نہ تھا۔مگر ہیہات ان کے اطوار، ان کے عادات اس نیت خیر سے یک سر جدا ہیں۔ذکر فضائل شریف مقصود ہوتا تو کیا ان محبوبانِ خدا کی فضیلت صرف یہی شہادت تھی؟ بے شمار مناقب عظیمہ اللہ عزوجل نے انھیں عطا فرمائے۔انھیں چھوڑ کر اسی کو اختیار کرنا اور اس میں طرح طرح سے بہ الفاظ رقت خیز ونوحہ نما معانی حزن انگیز وغم فزا بیان کو وسعتیں دینا انھیں مقاصد فاسدہ کی خبریں دے رہا ہے۔

غرض عوام کے لیے اس میں کوئی وجہِ سالم (درست وجہ) نظر آنا سخت دشوار ہے۔پھر مجلس میلاد اقدس تو عظیم شادی وخوشی وعید اکبر کی مجلس ہے۔اذکارِ غم وماتم اس کے مناسب نہیں۔فقیر اس میں ذکر وفات والا بھی جیسا کہ بعض عوام میں رائج ہے، پسند نہیں کرتا۔حالانکہ حضور کی حیات بھی ہمارے لیے خیر اور حضور کی وفات بھی ہمارے کے لیے خیر۔صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

اس تحریر کے بعد علامہ محدث سیّدی محمد طاہر پٹنی قدس سرہٗ الشریف کی تصریح نظر فقیر سے گزری کہ انھوں نے بھی اس رائے فقیر کی موافقت فرمائی۔والحمدللہ رب العٰلمین، آخر کتاب مستطاب مجمع بحار الانوار میں فرماتے ہیں:

شھر السرور والبھجۃ مظھر منبع الانوار والرحمۃ شھر ربیع الاوّل فانہ شھر امرنا باظھار الحبور فیہ کل عام فلا نکدرہ باسم الوفاۃ فانہ یشبہ تجدید الماتم و قدنصوا علی، کَرَاھَتِہٖ کل عام فی سیّدنا الحسین مع انہ لیس لہ اصل فی امھات البلاد

الاسلامية وقد تحاشوا عن اسمه فی اعراس الاولياء فکيف به فی سيّد الاصفياء علی اللّٰه تعالیٰ عليه وسلم.

یعنی ماہِ مبارک ربیع الاول خوشی وشادمانی اور سرچشمۂ انوار ورحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانِ ظہور ہے۔ ہمیں حکم ہے کہ ہر سال اس میں خوشی ظاہر کریں، تو ہم اسے وفات کے نام سے مکدر نہ کریں گے کہ یہ تجدید ماتم کے مشابہ ہے اور بے شک علما نے تصریح کی کہ ہر سال جو سیّدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ماتم کیا جاتا ہے، مکروہ ہے۔ اور خاص اسلامی شہروں میں اس کی اصل نہیں اور اولیائے کرام کے عرسوں میں نام ماتم سے احتراز کرتے ہیں تو حضور پرنور سیّد الاصفیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معاملے میں اسے کیوں کر پسند کر سکتے ہیں۔ **فالحمد للّٰه علیٰ مالهم واللّٰه سبحانه و تعالیٰ اعلم.** (فتاویٰ رضویہ، ۹، قسط: ا، ص: ۶۲-۶۳)

سبیل لگانا، کھانا کھلانا اور لنگر لٹانا:

ایامِ عشرۂ محرم الحرام شریف میں سبیل لگانے، کھانا کھلانے اور لنگر لٹانے سے متعلق سوال کے جواب میں اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ ارقام فرماتے ہیں:

پانی یا شربت کی سبیل لگانا جبکہ بہ نیت محمود اور خالصاً لوجہ اللہ ثواب رسانیِ ارواحِ طیبہ ائمۂ اطہار مقصود ہو، بلاشبہ بہتر و مستحب وکارِ ثواب ہے۔ حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذا کثرت ذنوبک فاسق الماء علی الماء تتناثر کما یتناثر الورق من الشجر فی الریح العاصف.

جب تیرے گناہ زیادہ ہوجائیں تو پانی پر پانی پلا، گناہ جھڑ جائیں گے، جیسے سخت آندھی میں پیڑ کے پتے۔ (رواہ الخطیب عن انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

اس طرح کھانا کھلانا، لنگر بانٹنا بھی مندوب وباعث اجر ہے۔ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: **اِنَّ اللّٰـهَ عَزَّوَّ جَلَّ یُبَاهِیُ مَلَائِکَتَه' بِالَّذِیْنَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَبِیْدَهٗ.**

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے جو لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں، فرشتوں کے ساتھ مباہات فرماتا ہے (کہ دیکھو یہ کیسا اچھا کام کر رہے ہیں) (رواہ ابوالشیخ فی الثواب عن الحسن مرسلاً)

لنگر لٹانا جسے کہتے ہیں کہ لوگ چھتوں پر بیٹھ کر روٹیاں پھینکتے ہیں، کچھ ہاتھوں میں جاتی ہیں، کچھ زمین پر گرتی ہیں، پاؤں کے نیچے آتی ہیں، یہ منع ہے کہ اس میں رزق الٰہی کی بے تعظیمی ہے۔

بہت علماء نے تو روپیوں پیسوں کا لٹانا جس طرح دُلھن دولھا کی نچھاور میں معمول ہے، منع فرمایا کہ روپیہ پیسہ کو اللہ عزوجل نے خلق کی حاجت روائی کے لیے بنایا ہے تو اسے پھینکنا نہ چاہیے۔ پھر روٹی کا پھینکنا تو سخت بے ہودہ ہے۔ (فتاویٰ رضویہ: ۹، قسط: ا، ص: ۸۸)

تعزیہ کی مٹھائی:

تعزیہ پر یا اس سے قریب رکھ کر جس مٹھائی وغیرہ پر فاتحہ دی جاتی ہے اس کے متعلق صحیح مسئلہ بیان کرتے ہوئے امام اہل سنت ارشاد فرماتے ہیں:

تعزیہ پر جو مٹھائی چڑھائی جاتی ہے، اگرچہ حرام نہیں ہوجاتی مگر اس کے کھانے میں جاہلوں کی نظر میں ایک امر ناجائز شرعی کی وقعت بڑھانی اور اس کے ترک میں اس سے نفرت دلانی ہے۔ لہٰذا نہ کھائی جائے۔

(فتاویٰ رضویہ، ج ۹، قسط: ا، ص: ۱۸۹)

یعنی محض تعزیہ کے پاس رکھ دینے سے کوئی چیز حرام نہیں ہوجاتی کہ اصل مقصود ایصال ثواب ہی ہے۔ ہاں! اس میں جہلا کے عمل کی حوصلہ افزائی ہے اور شرعاً تعزیہ کے پاس لے جانے کی کوئی حاجت بھی نہیں اور مروّجہ تعزیہ ناجائز بھی ہے۔ لہٰذا وجوہ سے بچنا ہی چاہیے تاکہ اس غلط رسم کا رد بھی ہوجائے اور اسے فروغ بھی نہ ملے۔

ایک دوسرے فتوے میں اعلیٰ حضرت مزید ارشاد فرماتے ہیں:

واقعی حضرت امام کے نام پاک کی نیاز کھانی چاہیے، اور تعزیہ کا چڑھایا ہوا کھانا نہ چاہیے۔ اور فرماتے ہیں: تعزیہ پر چڑھانے سے حضرت امام رضی اللہ عنہ کی نیاز نہیں ہوجاتی اور اگر نیاز دے کر چڑھائیں یا چڑھا کر نیاز دلائیں تو اس کے کھانے سے احتراز (پرہیز) چاہیے۔

اور جو اس کو حرام کہتا ہے اس کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تعزیہ کا چڑھاوا کھانا ان وجوہ (اسباب) سے جو ہم نے ذکر کیں مکروہ ناپسند ضرور ہے، مگر حرام کہنا غلط ہے۔

فتاویٰ عالم گیری میں اس بکرے کی نسبت جو ہندو نے اپنے بت کے نام مسلمان سے ذبح کرایا اور مسلمان نے اللہ عزوجل کے لیے تکبیر کہہ کر ذبح کردیا، تصریح فرمائی ہے کہ حلال ہے۔ **ویکرہ للمسلم.** مسلمان کے لیے مکروہ ہے۔ جب وہاں صرف کراہت کا حکم ہے تو یہاں تحریم (حرام قرار دینا) کیوں کر۔ (فتاویٰ رضویہ، ج: ۹، قسط: ا، ص: ۲۱۹)

یزید اور یزیدیوں کا حکم:

یزید اور اس کے ہم راہیوں کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں اعلیٰ حضرت ارشاد فرماتے ہیں:

ہم راہیانِ یزید یعنی جو اس کے مدد ومعاون تھے ضرور خبیث ومردود تھے اور کافر وملعون کہنے میں اختلاف ہے۔ ہمارے امام (اعظم) کا مذہب سکوت

ہے۔ اور جو کہے وہ بھی مورد الزام نہیں کہ یہ بھی امام احمد وغیرہ بعض ائمۂ اہلِ سنت کا مذہب ہے۔ (فتاویٰ رضویہ، ج:۹، قسط:۲، ص:۲۷۳)

روافض کی مجالس کا حکم:

سوال ہوا کہ شیعہ کی مجلس مرثیہ خوانی میں اہلِ سنت و جماعت کو شریک ہونا جائز ہے یا نہیں؟ تو امام اہلِ سنت نے جواب میں ارشاد فرمایا:

(شیعہ کی مجلس مرثیہ خوانی میں شرکت) حرام ہے۔ حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مَنْ کَثَّرَ سوادَ قوم فهو منهم. (جو کسی قوم کا جتھا بڑھائے وہ انھیں میں ہے)

وہ بدزبان ناپاک لوگ اکثر تبرا بک جاتے ہیں، اس طرح کہ جاہل سننے والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی اور متواتر سنا یا گیا ہے کہ سنیوں کو جو شربت دیتے ہیں اس میں نجاست ملاتے ہیں اور کچھ نہ ہو تو اپنے یہاں کے ناپاک قلتیں کا پانی پلاتے ہیں اور کچھ نہ ہو تو وہ روایاتِ موضوعہ (گڑھی روایات) وکلماتِ شنیعہ (برے کلمات) وماتم حرام سے خالی نہیں ہوتے اور یہ دیکھیں، سنیں گے اور منع نہ کرسکیں گے۔ ایسی جگہ جانا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّکْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ. (تو یاد آنے پر ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھ۔ کنز الایمان، الانعام ۶-۶۸) (فتاویٰ رضویہ، ج:۹، قسط:۱، ص ۶ ۷ ا و ۲۲۴)

ہمارے بہت سے سنی بھائی رافضیوں کی مجالس میں چلے جاتے ہیں ان کو اس فتوے سے درس لینا چاہیے کہ جس مجلس میں صحابۂ کرام خصوصاً صدیقِ اکبر و فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں تبرا بکا جائے اس میں جانا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ اور بھی بہت سے غلط عقائد بیان کرجاتے ہیں بلکہ ائمۂ کرام کو معصوم بتاتے ہیں، بعض ائمۂ کرام کو انبیا پر ترجیح دیتے یا ان کے برابر گردانتے ہیں، لہٰذا یقیناً ان روافض کی مجالس سے سنیوں کو پرہیز ضروری ہے۔

محبتِ اہل بیت اور تجدید حزن:

کچھ لوگوں کا تصور ہے کہ اگر اہلِ سنت سے محبت ہے تو عشرۂ محرم میں مصائبِ کربلا پر غم منانا ضروری ہے ورنہ محبت نہیں اسی طرح کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں:

اہلِ سنت و جماعت کا مدار ایمان، حضور اقدس سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت ہے، جب تک اپنے ماں باپ اولاد وتمام جہان سے زیادہ حضور کی محبت نہ رکھے، مسلمان نہیں۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ. (صحیح بخاری:۱/۷، کتاب الایمان)

تم میں کوئی مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے ماں باپ اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہوں۔

اور محبّ کو محبوب کی ہر شئے عزیز ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کی گلی کا کتا بھی۔ حضرت مولانا قدس سرہٗ نے مثنوی شریف میں حضرت مجنوں رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کی حکایت تحریر فرمائی کہ کسی نے ان کو دیکھا کمالِ محبت کے طور پر ایک کتے کے بوسے لے رہے ہیں۔ اعتراض کیا کہ کتا نجس ہے۔ چنین ہے چناں ہے، فرمایا تو نہیں جانتا:

کہ طلسم بستۂ مولیٰ ست ایں

پاسبانِ کوچۂ لیلیٰ ست ایں

یہ کتا لیلیٰ کی گلی کا ہے محبانِ صادق کا جب دنیا کے محبوبوں کے ساتھ یہ حال ہے جن میں ایک حسن فانی کا کمال سہی ہزاروں عیب ونقص بھی ہوتے ہیں، تو کیا کہنا ہے۔ ہمارے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جنھیں تمام اوصاف حمیدہ میں اعلیٰ کمال اور جن کا ہر کمال ابدی اور لازوال اور جو ہر عیب ونقص سے منزہ و بے مثال۔ ان کا ہر علاقہ والا سنی کے سر کا تاج ہے، صحابہ ہوں، خواہ ازواج، خواہ اہل بیت رضوانُ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ پھر کیا کہنا ہے ان کا جو حضور کے جگر پارے اور عرش کی آنکھ کے تارے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

حُسَیْنٌ مِّنِّیْ وَ اَنَا مِنْ حُسَیْنٍ اَحَبَّ اللّٰهُ مَنْ اَحَبَّ حُسَیْنًا حُسَیْنٌ سِبْطٌ مِّنَ الْاَسْبَاطِ.

حسین میرا اور میں حسین کا، اللہ دوست رکھے اسے جو حسین کو دوست رکھے، حسین ایک نسل نبوت کی اصل ہے۔ (ترمذی ابواب المناقب ۲/۲۱۹)

یہ حدیث کس قدر محبت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، ایک بار نام لے کر تین بار ضمیر کافی تھی، مگر نہیں ہر بار لذتِ محبت کے لیے نام ہی کا اعادہ فرمایا:

کما قَالُوا فی قول القائل:

تَـا لـلّٰـهِ یَـا ظَبْیَـات القـا ع قُلْنَ لَنَـا

اَلَیْـلایَ مِـنْـکُـنَّ اَمْ لَیْـلَـی مِّنَ الْبَشَرِ

(خدا کی قسمت اے وادی کی ہرنیو! ہمیں یہ بتادو کیا میری لیلیٰ تم میں سے ہے یا انسانوں میں سے ہے)

کون سا سنی ہوگا جسے واقعۂ ہائلۂ کربلا (کربلا کے دردناک واقعے) کا غم نہیں یا اس کی یاد سے اس کا دل محزون (غمگین) اور آنکھ پر نم نہیں۔ ہاں مصائب میں ہم کو صبر کا حکم فرمایا ہے، جزع فزع (رونا، پیٹنا اور گریہ وزاری) کو شریعت منع فرماتی ہے اور جسے واقعی دل میں غم نہ ہوا سے جھوٹا اظہارِ غم ریا ہے۔

باقی صفحہ 15 پر

عرفان احمد چھپراوی ☆

امام اعظم اور علم حدیث

امام اعظم پر بعض اعتراضات کا جائزہ

عظیم الشان علم 'علم حدیث' اور اس علم کے عظیم ماہر 'امام اعظم ابوحنیفہ' جب مضمون کی سرخی بنیں تو مقالہ نگار کے لیے موضوع کی عظمت اور معیار کے ساتھ انصاف ضروری ہو جاتا ہے، خصوصاً ایسے حالات میں جب ایک طرف عہد جدید میں عالم عرب کے ایک مشہور ادیب کا آزاد فکر قلم حدیث مبارک پر یوں تبصرہ کرے:

اما الحدیث فلم یدون الا حوالی ینتصف القرن الثانی للهجرة، وکان قبل ذالک انما یروی من الذاکرة والذاکرة کثیراً ماتخون فناله من تغییر الکلمات، واختلاف الروایات اکثر ممانال الشعر الجاهلی. (تاریخ الادب العربی، الدکتور احمد حسن زیات)

''حدیث تو تقریباً دوسری صدی ہجری کے نصف اخیر میں ضبط تحریر ہوسکی ورنہ تو اس سے پہلے صرف زبانی روایتیں ہوتی تھیں اور زبانی روایتوں میں اکثر و بیشتر غلطیاں ہو جاتی تھیں جس کی وجہ سے شعر جاہلی سے بڑھ کر حدیث مبارک میں کلمات کا تغیر و تبدل اور روایتوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔''

تو دوسری طرف عالم اسلام کی عظیم شخصیت، فقہ کے امام، زہد و ورع کے پیکر، تقویٰ و پرہیزگاری کے آئینہ دار اور قرآن و سنت کے مزاج شناس امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے تعلق سے طبقہ متقدین کا ایک نقاد خطیب بغدادی اپنی شہرہ آفاق تصنیف میں یہ قول نقل کردے:

''**أبـاوهب یقول سمعت عبدالله. هو ابن المبارک یقول کان أبـو حـنـیفه یتیما فی الحدیث.**'' (تاریخ بغداد، للخطیب بغدادی، جلد ۱۱، ص ۲۹۲، دارالفکر بیروت، لبنان)

ابووہب کہتے ہیں میں نے عبداللہ ابن مبارک کو فرماتے ہوئے سنا ابوحنیفہ کو حدیث کا زیادہ علم نہیں تھا۔

حدیث مبارک اور امام اعظم ابوحنیفہ پر اس طرح کے بے بنیاد الزامات کا جواب اور حقیقت کی نقاب کشائی تو بتوفیق ایزدی آئندہ صفحات میں ہوگی **انشاء اللّٰه الذی هو الموفق المستعان** لیکن سردست اس سے پہلو تہی کرنے کے باوجود علامہ ابن حجر ہیتمی مکی شافعی کا قول ضرور نقل کردوں گا:

''کسی فوت شدہ شخصیت کے متعلق لوگوں کا مختلف الرائے ہونے سے اس کے علو مرتبت پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔'' (امام اعظم رضی اللہ عنہ۔ علامہ سید شاہ تراب الحق قادری، رضا اکیڈمی)

امام اعظم ابوحنیفہ کا علم حدیث میں کیا مقام ہے دراصل اس چیز کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے معاصرین کی آرا، علم حدیث کے تعلق سے ان کے پیشتر وحضرات کے موافق اور ان کے زمانے کی علمی، سیاسی اور سماجی صورتِ حال کو جاننے کے ساتھ اس سوال ''ان کے زمانے میں علم حدیث کی حیثیت اور صورتِ حال کیا تھی؟'' کے جواب پر بھی غور کرنا ہوگا، اس کے بعد ہی حقیقت کی تہہ تک رسائی ممکن ہو سکے گی، ورنہ عصر حاضر میں پیٹرو ڈالر کی مدد سے غیر مقلدین، جنھیں غالی اور متشدد مقلدین کہنا زیادہ مناسب ہوگا، نے امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے ناموس پر اتہامات والزامات کی دبیز چادر ڈالنے کی جو کوشش کی اس سے حقیقت کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ آج تحقیق کے نام پر ان کی تحریف و تلبیس کا سفر طوفانی رفتار اختیار کر چکا ہے اور اس طوفان کی زد میں بڑے بڑے محدثین فقہا حتیٰ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بھی لانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

علمی صورتحال:

جس وقت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے شعور و آگہی کی منزل میں قدم رکھا اس وقت تک ان کا مولد و مسکن کوفہ علم حدیث کی روشنی میں پوری طرح نہا چکا تھا، جس کی کرنیں غارِ حرا سے پھوٹی تھیں۔ اپنے وقت کی نابغہ روزگار شخصیتوں کی پوری فہرست تاریخ کے صفحات پر موجود ہے جس میں اجلہ صحابۂ کرام کی ایسی مقدس جماعت بھی تھی جس نے دو عالم کے سرکار سے ایک عرصہ فیض حاصل کیا تھا۔ چنانچہ فاتح کسریٰ سعد بن ابی وقاص، حضرت حذیفہ، حضرت عمار، حضرت سلمان اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین کے قدوم میمنت لزوم سے کوفہ کی سرزمین فیضیاب ہو چکی تھی۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کو خصوصی طور پر کوفہ بھیجا گیا تھا جن کا شمار صف اوّل کے فقہا صحابہ میں ہوتا ہے۔ حضرت امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل کوفہ سے یہ کہتے ہوئے بھیجا:

''**وقـد آثـرتـکم بعبدالله علی نفسی**'' (مقدمہ نصب الرایہ تخریج احادیث الہدایۃ للزیلعی، ج ۱، ص ۱۵، دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان)

☆ ای-میل: fanquadri@hotmail.com

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی شخصیت صحابہ کرام کے درمیان بہت عظیم تھی یہاں تک کی حضرت عمر بھی ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ان کے بارے میں حضرت عمر فرماتے کنیف ملئی فقھا. ایک روایت میں ہے علماً. (مقدمه نصب الرایه تخریج احادیث الهدایة للزیلعی ۲۲۴، ج ۱، ص ۱۵، دارالکتب العلمیه بیروت لبنان) انھوں تقریباً دو دہائی تک سرورِ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکت میں رہ کر قرآن و سنت کے اسرار و رموز سے آ گاہی حاصل کی تھی باب مدینۃ العلم شیر خدا مولا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اسے اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔

اب ہم کوفہ سے باہر نکل کر عالم اسلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری نظر سب سے پہلے مرکزِ علم مدینۃ الرسول پر جا کر ٹھہرتی ہے۔ مدینہ منورہ اس وقت بھی مرکزِ علم تھا، خلفائے ثلاثہ کے بعد انتظامی امور اور حکومتی ادارے شام و کوفہ منتقل ہونے کے باوجود صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد یہاں موجود تھی، علمی سرگرمیاں پورے شباب پر تھیں، اس کے علاوہ شام اور دیگر بلادِ اسلامیہ میں بھی صحابہ کرام کو تعلیم دین کے لیے بھیجا گیا تھا جہاں وہ قرآن و سنت کے موتی لٹا رہے تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کے مولد و مسکن کوفہ اور مدینہ منورہ کا علمی حال اجمالاً ہمیں معلوم ہو سکا، اب مختصراً سیاسی صورتِ حال کے تعلق سے بھی ہم گفتگو کریں گے تا کہ ہمارے باشعور قارئین کو پیش نظر موضوع اچھی طرح سمجھنے میں آسانی ہو۔

راجح قول کی بنیاد پر امام اعظم ابوحنیفہ کی پیدائش ۸۰ ہجری اور وفات ۱۵۰ ہجری میں ہوئی۔ چنانچہ آپ نے سلطنتِ امویہ کا عروج بھی پایا اور اس کا انحطاط و زوال بھی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، پھر اس کے بعد آپ نے عباسی سلطنت کا قیام اور اس کا استحکام بھی اپنی نگاہوں سے ملاحظہ فرمایا۔ اہلِ دانش و بینش پر یہ بات مخفی نہیں کہ کسی ملک میں ایک حکومت کا زوال اور نئی حکومت کا قیام کچھ عرصہ کے لیے اسے شر و رفتن کی آماجگاہ بنا دیتا ہے۔ شر پسند عناصر ایسے افراتفری کے ماحول سے فائدہ اٹھا کر نت نئے فتنہ کو ہوا دیتے ہیں چنانچہ کوفہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے میں پیدا ہونے والے باطل فرقوں کو اس عرصہ میں پھلنے پھولنے کا خوب موقع میسر آیا اور سلطنتِ عباسیہ کے قیام کی تمہید اور بعد قیام عراق سب کی نظروں کا مرکز بن گیا۔ باطل اور گمراہ فرقوں نے اپنے مفسدانہ نظریات کی اشاعت اور مقبولِ عام بنانے کے لیے حدیثیں گڑھنے کا سلسلہ شروع کیا۔

اصحاب الرائے کا پس منظر :

امام اعظم ابوحنیفہ پر سب سے خطرناک الزام جو لگایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے تھے۔ رائے اور قیاس سے زیادہ کام لیتے تھے اور اسی الزام کے ذریعہ یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آپ کو حدیث کا بہت کم علم تھا۔ آپ قلیل الحدیث تھے لیکن اس کا پس منظر جان کر یقینی طور پر اس الزام کی بے وقعتی آشکار ہو جائے گی۔

جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ جس وقت امام اعظم نے شعور و آگہی کی منزل میں قدم رکھا اس وقت عالم اسلام میں دو جگہ علمی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ پہلا مدینہ منورہ دوسرا کوفہ۔ اہلِ مدینہ خود کو اہل الحدیث کہتے اور اہلِ کوفہ کو اصحاب الرائے سے موسوم کرتے تھے۔ گویا عالم اسلام علمی اعتبار سے دو حصوں میں منقسم تھا، اہل الحدیث و اہل الرائے۔

اہل الحدیث کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ قرآن و احادیث کی موجودگی میں ہمیں غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں چنانچہ کسی بھی مسئلہ کے تعلق سے پہلے وہ قرآن کریم کی طرف دیکھتے، اگر کوئی نص مل جاتا تو فیصلہ فرما دیتے بصورت دیگر احادیثِ مبارکہ کی طرف رجوع کرتے اور کوئی حدیث مل جاتی تو اس کی روشنی میں فیصلہ کرتے۔ اگرچہ وہ حدیث ضعیف ہی کیوں نہ ہو، اگر ضعیف حدیث بھی مل جاتی تو وہ اس کو اپنے اجتہاد و رائے و پر ترجیح دیتے اور غور و فکر سے گریز کرتے۔ اسی سے عصرِ حاضر کے ان متشدد اور غالی مقلدین کی قلعی کھل جاتی ہے جو خود کو اہل الحدیث ہونے کا دم بھرتے ہیں اور عمل بالحدیث کے نام پر امت میں اختلاف و انتشار کا بیج بوتے ہیں۔ یہ مدعی اہل الحدیث تو اجتہاد و رائے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، صحیحین کی چند حدیثیں از بر کرنے کے بعد ائمہ اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قد ناپنا شروع کر دیتے ہیں۔

دوسرے گروہ اہل الرائے کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ وہ قرآنِ مقدس کو مقدم رکھتے، اس کے بعد احادیث کریم پھر رائے قیاس کا نمبر آتا۔ یہ لوگ قبولِ حدیث میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ایسا کیوں تھا؟ ڈاکٹر حسن زیارت فرماتے ہیں:

”وھو أول من بوب الفقه وحرر فصوله ورتب قیاسه وقال فیه بالرأی لکثرة الوضاعین من زنادقة العراقه.“

(تاریخ الادب العربی، ڈاکٹر احمد حسن زیات، ص ۲۸۱، ادارہ اشاعت دینیات، دہلی)

پہلے پہل انھوں (امام ابوحنیفہ) نے ہی فقہ کے ابواب باندھے، فصول متعین کیے، قیاس کو ترتیب دیا اور عراق کے احادیث گڑھنے والے زندیقوں کی وجہ سے اخذ حدیث میں غور و فکر بھی کیا۔

اسی حزم و احتیاط کی وجہ سے ان پر قلیل الروایۃ ہونے کا الزام لگتا تھا۔ چنانچہ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی ہے کہ قلیل الراوایۃ ہونے کا الزام

قلّتِ حدیث کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اخذِ حدیث میں غور وفکر و چھان بین کی وجہ سے اہل الرائے، قلیل الراوایۃ اور قلیل الحدیث جیسے الزام سے مہتّم ہوتے تھے، اسی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اصحاب الرائے کو اصحاب الرائے اس وجہ سے نہیں کہا گیا کہ وہ رائے اور قیاس کو احادیث پر مقدم کرتے یا احادیث مبارکہ کو نظر انداز کردیتے تھے۔ لیکن عصرِ حاضر کے مدعیانِ اہل الحدیث نے اس لفظ کا سوئے استعمال کرکے اسے ایک گالی کے درجے میں پہنچادیا ہے۔ شبلی نعمانی کا کہنا ہے:

امام رازی مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں: **ان اصحاب الرائ اظهر وامذاهبهم وكانت الدنيا مملوءة من المحدثين ورواة الأخبار فلم يقدر احدم نهم الطعن فى اقاويل اصحاب الرائ.** (سیرۃ النعمان، شبلی نعمانی، ص۱۴۳)

یعنی جس وقت اصحاب الرائے نے اخذِ حدیث میں چھان بین کا موقف پیش کیا اس وقت دنیا محدثین وراویانِ حدیث سے بھری ہوئی تھی لیکن کوئی بھی ان کی باتوں کو مسترد نہیں کرسکا۔

علامہ تراب الحق فرماتے ہیں: ’’حدیث اور رجال کی کتب دیکھیں تو اکثر راوی کوفہ کے نظر آتے ہیں۔ علامہ ذہبی نے تذکرہ الحفاظ کی صرف پہلی جلد میں کوفہ کے تقریباً سو حفاظ حدیث کے اسمائے گرامی لکھے ہیں جن میں سے اکثر صحاحِ ستہ بلکہ صحیحین کے راوی ہیں۔ کیا اس کے باوجود کوئی یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ کوفہ والوں کو حدیث کا علم نہیں۔ (امام اعظم رضی اللہ عنہ، علامہ سید شاہ تراب الحق قادری، رضا اکیڈمی)

امام یوسف زیلعی مقدمہ نصب الرایہ التخریج احادیث الہدایۃ میں کوفہ کے بارے میں جو اصحاب الرائے کا مرکز تھا یہ تبصرہ فرماتے ہیں:

’’فابن مسعود هذا عنى يتفقيه أهل الكوفة والتعليمهم القرآن من سنة بناء الكوفة الى أواخر خلافة عثمان رضى اللّٰه عنه عنايه لامزيد عليها الى أن امثلات الكوفة بالقرء والفقهاء والمحديثين بحيث أبلغ بعض ثقات اهل العلم عدد من تفقه عليه وعلى اصحابه نحوأربعة آلاف عالم وكان هناک معه أمثال سعد بن مالک ابى وقاص وحذيفة عمار و سلمان و ابوموسىٰ من اصفياء الصحابة رضى اللّٰه عنهم يساعدونه فى مهمته حتى ان على بن أبى طالب كرم اللّٰه وجهه لما انتقل الى الكوفة سرمن كثرة فقهائها ومحدثيها وقال: رحمة اللّٰه ابن ام عبدقد ملا هذه القريه علما، وفى لفظ اصحاب ابن مسعود سرج هذه القرية. (مقدمہ نصب الرایہ تخریج احادیث الهداية للزیلعی، ج۱،ص۱۵، دارالکتب العلمیہ بیروت، لبنان)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعود نے اہل کوفہ کو قرآن اور فقہ کی تعلیم، جس سال کوفہ آباد ہوا، اسی سال سے دینا شروع کردی اور کتاب وسنت کے خوب جوہر لٹائے۔ یہ سلسلہ حضرت عثمان کی خلافت کے اخیر زمانے تک رہا یہاں تک کوفہ قرا، فقہا اور محدثین سے بھر گیا۔ بعض اہل علم کے مطابق ان کے شاگرد اور ان کے شاگردوں کے شاگرد کی تعداد تقریباً چار ہزار تھی۔ سعد بن مالک ابی وقاص، حذیفہ عمار، سلمان اور ابوموسیٰ جیسے پاکباز صحابۂ کرام کی جماعت حضرت عبداللہ ابن مسعود کی اس تعلیمی مہم میں ہاتھ بٹا رہی تھی یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب کوفہ تشریف لائے تو وہاں فقہاء ومحدثین کی کثرت دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ ام عبد کے بیٹے (عبداللہ ابن مسعود) پر رحم فرمائے جس نے اس جگہ کو علم سے معمور کردیا ہے، اور ایک قول کے مطابق: ابن مسعود اور ان کے اصحاب اس جگہ کے چراغ ہیں۔

حضرت علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں فرمایا:

وقال سهل بن سرى: قال البخارى: دخلت الى الشام و مصر والجزيره مرتين والى البصره اربعة مراة و أقمت بالحجاز ستة أعوام والاأحصى كم دخلت الى الكوفه و بغداد مع المحدثين. (مقدمہ فتح الباری، علامہ ابن حجر عسقلانی، ج۱،ص۷۴۴، دار ابی حیان)

ترجمہ: سہل بن سری کا کہنا ہے، امام بخاری نے فرمایا: میں نے شام، مصر اور جزیرہ کا دو مرتبہ سفر کیا، بصرہ کا چار مرتبہ اور حجاز میں میرا قیام چھ سال رہا اور محدثین کے ساتھ بغداد و کوفہ اَن گنت مرتبہ گیا۔

مذکورہ بالا گفتگو سے بہرحال ان الزامات واتہامات کے پردے چاک ہوگئے کہ اہلِ کوفہ سے ہونے کی وجہ سے آپ کا تعلق اصحاب الرائے سے تھا اور اصحاب الرائے کو حدیث کا کم علم تھا، اہلِ کوفہ جنھیں اصحاب الرائے کہا جاتا تھا اپنی رائے کو احادیث پر مقدم رکھتے تھے۔ اب ہم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی بات آپ کے سامنے پیش کرکے دوسرے الزامات کا جائزہ لیں گے۔ شاہ صاحب اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ’حجۃ اللہ البالغۃ‘ میں ارشاد فرماتے ہیں:

’’وكان ابراهيم و اصحابه يرون أن عبداللّٰه بن مسعود و اصحابه أثبت الناس فى الفقه كما قال علقمه لمسروق: هل أحد منهم أثبت من عبداللّٰه، وقول ابى حنيفة الأوزاعى

ابراهيم أفقه من سالم ولولا فضل الصحبة لقلت ان علقمة أفقه من عبدالله بن عمر وعبد الله وعبدالله هو عبدالله وأصل مذهبه فتاوى عبدالله بن مسعود و قضايا على رضى الله عنهما وفتاواه وقضايا شريح وغيره من قضاة الكوفة.

(حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ص۱۴۴، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، ۱۳۷۳ھ)

ترجمہ: ابراہیم اور ان کے اصحاب کا یہ ماننا تھا کہ حضرت عبداللہ اور ان کے ہم نشین فقہ کے معاملہ میں سب سے زیادہ معتمد علیہ تھے جیسا کہ علقمہ نے مسروق سے کہا کہ عبداللہ ابن مسعود سے زیادہ با اعتماد کوئی نہیں اور ابوحنفیہ کا اوزاعی سے کہنا کہ ابراہیم سالم سے زیادہ بڑے فقیہ ہیں اور اگر حضرت عبداللہ ابن عمر مرتبہ صحابیت سے شرف یاب نہ ہوتے تو میں علقمہ کو ان سے بڑا فقیہ مانتا۔ اور ابوحنیفہ کے مذہب کی اصل حضرت عبداللہ بن مسعود کے فتاوے، حضرت علی کے فتاوے اور فیصلے، قاضی شریح اور دیگر کوفہ کے قاضیوں کے فیصلے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی عبارت سے واقف ہوکر بھی اگر کوئی شخص اصحاب الرائے کا وہی معنی ومفہوم مراد لیتا ہے جو بعض مدعیانِ اہل حدیث لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں یہ غور کر لینا چاہیے کہ ان کے الزام واتہام کا نشانہ صرف امام اعظم ابوحنیفہ کی ذات مقدس ہی نہ رہ جائے گی بلکہ ابراہیم نخعی، علقمہ اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جیسی جلیل القدر ہستیاں بھی اس تہمت سے متہم ہوتی نظر آئیں گی (معاذ اللہ) کیا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رائے وقیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے تھے؟ تو پھر یہ کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رائے وقیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے تھے جبکہ ان کے مذہب کی اصل حضرت عبداللہ ابن مسعود کے فتاوے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ پر دوسرا سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ آپ کا تعلق مرجۂ فرقہ سے تھا، حالانکہ امام اعظم کو بعض لوگوں نے جو مرجۂ کہا ہے تو اس کا پس منظر کچھ اور ہے۔ مرجۂ ایک الگ مستقل باطل اور گمراہ فرقہ تھا، جس کے عقائد قرآن وسنت سے متصادم تھے، لیکن امام اعظم کو مرجۂ ان کی طرح گمراہ اور فاسد نظریہ کی وجہ سے نہیں کہا گیا بلکہ اس کی وجہ دوسری تھی۔ مصری محقق شیخ ابوزہرہ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

''معتزلہ ہر اس شخص کو مرجۂ قرار دیتے تھے جو کبائر کے مرتکب کو دائمی جہنمی خیال نہ کرے بلکہ وہ یہ سمجھے کہ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر داخل جنت ہوگا اور خدا تعالیٰ اس کو معاف کردے گا چنانچہ اسی اعتبار سے امام ابوحنیفہ اور صاحبین پر مرجۂ کا اطلاق کیا گیا ہے۔'' (حیات حضرت امام ابوحنیفہ، شیخ ابوزہرہ مترجم غلام حریری، ص۲۴۳)

شبلی نعمانی نے اس حوالے سے یہ لکھا ہے:

''محدث ابن قتیبہ نے اپنی مشہور اور مستند کتاب المعارف میں مرجۂ کے عنوان سے بہت سے فقہا اور محدثین کے نام گنائے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں: ابراہیم تیمی، عمرو بن مرۃ، طلق الحبیب، حماد بن سلیمان، عبدالعزیز بن أبی داؤد، خارجہ مصعب، عمرو بن قیس الاصر، ابومعاویہ الضریر، یحییٰ بن زکریا، مسعر بن کدام حالانکہ اکثر حدیث وروایت کے امام ہیں اور صحیح بخاری ومسلم میں ان لوگوں کی سینکڑوں روایتیں موجود ہیں، ہمارے زمانے کے بعض کوتاہ بیں جو اس پر غش ہیں کہ امام صاحب کو بعض محدثین نے مرجۂ کہا ہے، ابن قتیبہ کی فہرست دیکھتے تو شاید ان کو ندامت ہوتی۔ محدث ذہبی نے میزان الاعتدال میں مسعر بن کدام کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ 'ارجاء' (مرجیہ ہونا) بہت سے علما کبار کا مذہب ہے اور اس مذہب کے قائل پر مواخذہ کرنا نہ چاہیے۔ یہ اسی ارجاہ کی طرف اشارہ ہے جو امام ابوحنیفہ کا مذہب تھا۔ (سیرۃ النعمان، شبلی نعمانی، ص۱۶۹)

حضرت امام اعظم پر قلیل الحدیث ہونے کا جو الزام لگایا جاتا ہے اس کی ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ بخاری ومسلم نے ان سے روایت نہیں کی کیونکہ انھیں حدیث کا بہت تھوڑا علم تھا۔

محترم قارئین! امام بخاری وامام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ کا امام اعظم سے روایت نہ کرنا امام اعظم کے قلیل الحدیث ہونے کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتی، کیونکہ قبولِ حدیث کے سلسلے میں محدثین کرام کا اپنا الگ الگ معیار تھا، امام نووی شارح صحیح مسلم فرماتے ہیں:

''کبھی راویوں کے تعلق سے محدثین کے درمیان اختلاف پیدا ہوجاتا ہے، یعنی ایک راوی کسی محدث کی بعض شرائط پر پورا نہ اترتا ہوا اور وہی راوی دوسرے محدث کے معیارِ قبولِ حدیث پر پورا اترتا ہو تو پہلا محدث اس سے روایت نہیں لیتا ہے اور دوسرے محدث کے نزدیک اس کی روایت قابل قبولِ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ابوزبیر مکی، سہیل بن ابی صالح شرائطِ صحت حدیث پر پورا اترتے ہیں، چنانچہ امام مسلم ان سے حدیث روایت کرتے ہیں اور یہی روایان حدیث امام بخاری کے معیار پر پورا نہیں اترتے تو امام بخاری ان سے اخذ روایت نہیں کرتے ہیں۔ یوں ہی عکرمہ مولی بن عباس، اسحاق بن محمد الفروی اور عمر بن مرزوق ایسے راوی ہیں جو امام بخاری کے معیار صحت پر پورا اترتے ہیں اور امام بخاری ان سے حدیث روایت کرتے

ہیں، لیکن یہی رواۃ امام مسلم کے شرائط صحت پر پورا نہیں اترتے تو امام مسلم ان سے روایت نہیں کرتے۔'' (ملخصاً از مقدمہ الامام النووی، ص ۲۲،)

شبلی نعمانی کا کہنا ہے:

''علامہ نووی نے مقدمہ شرح صحیح مسلم میں بعضوں کے نام بھی لکھے ہیں اور محدث حاکم کی کتاب المدخل سے نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کی تعداد جن سے امام مسلم نے مسند صحیح میں احتجاج کیا ہے اور امام بخاری نے جامع صحیح میں ان سے حجت نہیں لی ۶۲۵ ہے۔'' (سیرۃ النعمان، شبلی نعمانی، ص ۱۶۹)

شبلی نعمانی نے جو حوالہ دیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیں:

قال الحاکم أبو عبداللّٰہ الحافظ النیسا بوری فی کتابه المدخل الی معرفة المستدرک لهم مسلم أربعمأة وأربعة وثلاثون شیخا، وعدد من احتج بهم مسلم فی المسند الصحیح ولم یحتج بهم البخاری فی الجامع الصحیح ستمأه و خمسة وعشرون شیخا. (مقدمہ الامام النووی، ص ۲۲)

ترجمہ: امام حاکم ابوعبداللہ حافظ نیساپوری نے اپنی کتاب المدخل الی معرفۃ المستدرک میں ان راویوں کی تعداد جن سے امام بخاری نے جامع صحیح میں روایت لی ہے اور ان راویوں سے امام مسلم نے مسند صحیح میں روایت نہیں لی ہے ۴۳۴ ہے اور ان راویوں کی تعداد جن سے امام مسلم نے مسند صحیح میں روایت لی ہے اور امام بخاری نے جامع صحیح میں ان کی روایت نہیں لی ہے ۶۲۵ ہے۔

چنانچہ امام بخاری و امام مسلم کے درمیان معاصرۃ اور لقا کے سلسلہ میں جو اختلاف ہے سبھی جانتے ہیں۔ امام مسلم کے نقطۂ نظر سے اتفاق رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ امام مسلم کی رائے ہی جمہور کی بھی رائے ہے اور معاصرۃ ہی کافی ہے، جبکہ امام بخاری کے موقف سے اتفاق رکھنے والوں کا ماننا ہے کہ امام بخاری کا موقف جمہور کے موقف کے مطابق ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کا بھی علم حدیث میں اپنا ایک الگ مقام ہے اور انھیں بھی قبولِ حدیث کے سلسلے میں اپنا الگ معیار اپنانے کا حق حاصل ہے اور ان کے معیارِ قبول وصحت پر جو راوی پورا اترے اس کے حدیث کو قبول کرنے اور جو ان کے معیار صحت پر پورا نہ اترے اسے مسترد کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ جب ہم امام اعظم کے معیار صحت کو دیکھتے ہیں تو یہ امام بخاری و امام مسلم کی شرائط صحت سے زیادہ سخت نظر آتا ہے۔ شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ ''نزہۃ القاری'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''حضرت امام اعظم کے نزدیک دیگر اور شروط کے ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ راوی حدیث کو سننے کے وقت سے لے کر ادا کے وقت تک یاد رکھے ہو۔'' (مقدمہ نزہۃ القاری، مفتی شریف الحق امجدی، ص ۱۵۳)

تقریبا یہی بات شبلی نعمانی بھی کہی ہے: ''امام اعظم کے نزدیک صرف وہ حدیث حجت ہے جس کو راوی نے اپنے کانوں سے سنا ہو اور روایت کے وقت تک یاد رکھا ہو'' (سیرۃ النعمان، شبلی نعمانی، ص ۱۴۳)

اس کے علاوہ امام ابوحنیفہ راوی کے تفقہ کو ترجیح دیتے تھے۔ انھیں وجوہات کے بنا پر امام اعظم ابوحنیفہ کے یہاں امام بخاری و امام مسلم کے بہ نسبت کم رواۃ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ امام بخاری کے یہاں امام اعظم کی روایت نظر آنے کی اصل وجہ بیان کرتے ہوئے امام ابن حجر عسقلانی لکھتے ہے:

''**لم اکتب الا عمن قال الایمان قول و عمل.**'' (فتح الباری، علامہ ابن حجر عسقلانی، ص ۴۴۷، دار ابی حیان)

یعنی امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے صرف انھیں لوگوں سے روایت لی ہے جو ایمان کو قول عمل کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔

امام بخاری اپنے اس موقف میں بہت زیادہ سخت تھے، ان کا موقف تھا کہ ایمان مرکب ہے اور جو بھی اس سے اختلاف رکھتا اس سے وہ روایت کے قائل نہیں تھے، جبکہ ایمان کے سلسلے میں امام اعظم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایمان بسیط ہے۔ لہٰذا امام بخاری نے اسی بنیاد پر امام عظم کی روایت نہیں لی حالاں کہ انھیں اپنے جامع صحیح میں جن ۲۱ ثلاثیات پر فخر ہے۔ ان کے اکثر راوی امام عظم کے شاگرد ہیں۔ اور امام اعظم کا ذکر کس قدر والہانہ انداز میں فرماتے ہیں:

''**قال اسماعیل بن محمد الفارسی سمعت مکی بن ابراهیم ذکر اباحنیفة فقال: اعلم اهل زمانه.**'' (تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، جلد ۱۱، ص ۲۴۲، دار الفکر، بیروت، لبنان)

امام اعظم پر جرح اور ان کی حقیقت:

امام اعظم کے بعض مخلفین ان کے بعض معاصرین کی ان پر جرح پیش کر کے امام اعظم کی علمی حیثیت کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ہم ذیل میں ان جرحوں کی حقیقت اور حیثیت کا جائزہ لیتے ہیں:

''**وبعض الجروح صدره من معاصریه و قد تقدر فی مقره ان جرح المعاصر لا یقبل فی المعاصر لا شیما اذا کانت لتعصب و عداوة و الا فلیقبل جرح ابن معین فی الشافعی و احمد فی الحارث المحاسبی و الحارث فی احمد، و مالک فی محمد بن اسحاق صاحب حدیث الثقلین و القراء خلف الا مام و غیرهم فی غیرهم کلا و اللّٰہ**

لانقبل کلامهم فیهم.'' (مقدمة التعلیق حاشیه مؤطا امام محمد، علامہ عبدالحیٔ لکھنوی ص ۳۳ مجلس برکات مبارکپور، اعظم گڑھ)

ترجمہ: امام اعظم کے بعض معاصرین نے ان پر جرح کیا ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ ثابت شدہ ہے کہ معاصر کے حق میں معاصر کی جرح قابلِ قبول نہیں ہوتی، خاص کر جب جرح تعصب اور عداوت پر مبنی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو امام شافعی پر امام ابن معین کی جرح، امام احمد کی حارث محاسبی پر اور حارث محاسبی کی جرح امام احمد کے حق میں اور محمد بن اسحاق راوی حدیث ثقلین و قراۃ خلف الامام کے حق میں امام مالک کی جرح ضرور قابلِ قبول ہوتی۔ یونہی ان لوگوں کے علاوہ دوسرے حضرات کی جرحیں اپنے معاصرین کے حق میں قابلِ قبول ہوتیں لیکن بخدا ہم ہرگز ان کے حق میں ان کے معاصرین کی جرح قبول نہیں کرتے ہیں۔

امام اعظم پر بعض جرحیں تعصب و عداوت کی وجہ سے تھیں جن کا پتہ علامہ عبدالحیٔ رحمہ اللہ کی تحریر سے چلتا ہے۔ تاریخ بغداد کی ایک روایت سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے:

''**ماأحسد أحدا بالکوفة الا رجلین: أبو حنیفه فی فقهه والحسن بن صالح فی زهده.**'' (تاریخ بغداد للخطیب بغدادی، جلد ۱۱، ص ۲۴۱)

یعنی کوفہ میں دو لوگوں سے سب سے زیادہ حسد کیا گیا: امام ابوحنیفہ سے ان کے فقہ کی وجہ سے اور حسن بن صالح سے ان کے زہد و تقوی کی وجہ سے۔

اس طرح بعض متاخرین کے جرح کے سلسلے میں علامہ عبدالحیٔ فرماتے ہیں:

''**وبعض الجروح صدر من المتأخرین المتعصبین کالدار قطنی وابن عدی غیرهما ممن یشهد القرائن الجلیة بأنه فی هذا الجرح من المتعسفین، والتعصب امر لایخلو منه البشر الامن حفظه خالق القوی القدر و قدتقرر أن مثل ذلک غیر مقبول عن قائله بل موجب لجرح نفسه.**'' (مقدمة التعلیق حاشیه مؤطا امام محمد، علامہ عبدالحیٔ لکھنوی ص ۳۳ مجلس برکات مبارکپور، اعظم گڑھ)

یعنی بعض متعصب متاخرین کی جرحیں جیسے کہ دار قطنی اور ابن عدی وغیرہ کی واضح طور پر دلالت کرتی ہیں یہ جرحیں متشددین کی طرف سے ہیں اور تعصب سے وہی محفوظ رہ سکتا ہے جسے اللہ محفوظ رکھے پھر یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اس قسم کی جرحیں نہ صرف غیر مقبول ہیں بلکہ خود قابلِ جرح ہیں۔

آگے مزید فرماتے ہیں:

''**انه قد جرحه سفیان الثوری والدار قطنی الخطیب والذهبی وغیرهم من المحدثین وهذا قدصدر عن الغافلین، فاِن مطلق الجرح ان کان عیباً یترک به المجروح فلیترک البخاری و مسلم والشافعی وأحمد و مالک محمد بن اسحاق صاحب المغازی وغیرهم من أجله اصحاب المعانی فان کلا منهم مجروح مقدوح بل لم یسلم من الجرح أصحاب الرسول فهل یقول قائل بقبول الجرح فیهم کلاً واللّٰه لایقول به من هو ارباب العقول وان کان بعض اقسام الجرح موجبا لترک المجروح فالاِمام بری عنه عند ارباب الانصاف والنصوح فان بعض الجروح التی جرح به مبهم.**'' (مقدمة التعلیق حاشیه مؤطا امام محمد، علامہ عبدالحیٔ لکھنوی ص ۳۳ مجلس برکات مبارک پور، اعظم گڑھ)

یعنی سفیان ثوری، دار قطنی، خطیب بغدادی اور ذہبی وغیرہ نے امام پر جو جرحیں کی ہیں وہ ایسے لوگوں کی جرحیں ہیں جو امام کی قدر و منزلت سے ناآشنا ہیں اور پھر یہ کہ ہر جرح قابلِ قبول نہیں ہوتی اگر مطلق جرح عیب ہوتا اور مجروح اس سے متروک ہوجاتا تو بخاری، مسلم، امام شافعی، امام احمد، امام مالک اور محمد بن اسحاق کو بھی متروک ہونا چاہیے کیونکہ ان میں سے ہر ایک مجروح و مقدوح ہیں بلکہ صحابۂ کرام بھی تو اس سے محفوظ نہیں رہے۔ کیا کوئی صاحب عقل صحابۂ کرام کے حق میں اس قسم کی باتیں کرسکتا ہے ہرگز نہیں ہاں۔ بعض جرحوں کی وجہ سے مجروح متروک ہوجاتا ہے لیکن انصاف پسند اور غیر جانبدار حضرات کے نزدیک امام ایسی جرح سے محفوظ ہیں کیونکہ ان پر بعض جرحیں مبہم ہیں۔

دراصل امام اعظم کی ذہانت و فطانت، علمی قابلیت و صلاحیت سے بعض لوگ حسد میں مبتلا ہوگئے۔ کچھ لوگ تو مخالفین کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر امام سے بدظن ہوگئے اور ان پر جرحیں کر ڈالیں لیکن جب انھیں حقیقت کا علم ہوا تو اس سے باز آگئے اور جی کھول کر امام اعظم کی ستائش کی اور ان کے نقطۂ نظر کو سراہا، چنانچہ امام عبداللہ ابن مبارک اور امام اوزاعی کے درمیان امام اعظم کے تعلق سے گفتگو اور خود امام اعظم کی ملاقات امام باقر کے ساتھ ایسی واضح دلیلیں ہیں جو ان کی عظمت اور قدر و منزلت کو ثابت کرتی ہیں۔ بعض ایسے حضرات بھی ہیں جنھوں نے امام پر جرحیں کی ہیں لیکن دل میں امام اعظم کی بلندیِ عظمت کے معترف بھی ہیں جیسا کہ امام سفیان ثوری کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہم بعد میں اسے آپ کے سامنے پیش کریں گے لیکن سر دست تاریخ بغداد سے ایک واقعہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہیں گے جو امام اعظم کی علمی گہرائی پر روشن دلیل ہے ساتھ ہی

ساتھ اس سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ آپ کے معاصرین کے دل میں آپ سے حسد ایک فطری لازمہ ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں۔ (طوالت سے بچتے ہوئے ہم صرف ترجمہ پیش کررہے ہیں):

''نضر بن محمد نے فرمایا: حضرت قتادہ کوفہ آئے اور ابو بردہ کے گھر میں قیام پذیر ہوئے۔ ایک دن وہ باہر نکلے تو بہت سارے لوگ ان کے اِردگرد جمع ہوگئے۔ قتادہ نے کہا: قسم خدا کی! آج جو بھی مجھ سے کسی چیز کی رحلت و حرمت کے بارے میں پوچھے گا تو میں اسے جواب دوں گا۔ تو ابوحنیفہ کھڑے ہوئے اور کہا اے ابوالخطاب! ایک ایسا شخص جو گھر سے کئی سال تک غائب رہا اور اس کی بیوی کو یقین ہوگیا کہ وہ مر چکا ہے۔ چنانچہ اس نے دوسرے مرد سے شادی کرلی۔ اب اس کا شوہر اوّل لوٹ آیا۔ اس کے بارے میں کیا فیصلہ فرمائیں گے۔ وہ کس کی بیوی ہوگی؟ شوہر اوّل کی یا شوہر ثانی کی؟ اور اپنے اِردگرد جمع لوگوں سے فرمایا کہ اگر اس کے بارے میں یہ کوئی حدیث پیش کریں تو اس میں صداقت کی کوئی گنجائش نہیں اور اپنی رائے سے کچھ فرمائیں تو غلط ہوگا۔ قتادہ نے کہا: ہائے افسوس! یہ بتائیے کہ کیا یہ واقعہ رونما ہوا ہے؟ ابوحنیفہ نے کہا نہیں۔ قتادہ نے کہا جو چیز رونما نہیں ہوئی اس کے بارے میں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ ابوحنیفہ نے جواب دیا ہم آزمائش میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی اس سے راہِ نجات تلاش رہے ہیں تا کہ جب یہ چیز رونما ہوجائے تو ہم اس کے نشیب و فراز سے آگاہ رہیں۔ قتادہ نے کہا: قسم خدا کی؟ میں آپ لوگوں سے حلال و حرام کے بارے میں کچھ بھی گفتگو نہیں کروں گا، تفسیر کے تعلق سے آپ لوگ پوچھئے۔ ابوحنیفہ پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے ابوالخطاب! اللہ کے فرمان ''قال الذی عنده علم من الکتاب انا آتیک به قبل أن یرتد الیک طرفک'' کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ قتادہ نے کہا 'أنا آتیک' سے مراد آصف بن برخیا بن شمعیا حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے کاتب ہیں جو اسم اعظم جانتے تھے۔ ابوحنیفہ نے فرمایا: کیا حضرت سلیمان اسم اعظم جانتے تھے؟ قتادہ نے کہا: نہیں۔ ابوحنیفہ نے پوچھا: تو کیا ایک نبی کے زمانے میں نبی سے زیادہ جانکار کوئی ہوسکتا ہے؟ قتادہ لاجواب ہوگئے اور فرمایا: میں آپ لوگوں سے تفسیر کے بارے میں کچھ بھی گفتگو نہیں کروں گا۔ مجھ سے علماء کے اختلاف کے بارے میں پوچھئے۔ پھر ابوحنیفہ نے کھڑے ہوکر کہا: اے ابوالخطاب! کیا آپ مؤمن ہیں؟ قتادہ نے کہا 'أرجو' اللہ کی رحمت سے پرامید ہوں۔ ابوحنیفہ نے پوچھا: کیوں؟ قتادہ نے جواب دیا: ابراہیم علیہ السلام کے قول ''والذی أطمع أن یغفرلی خطیتی یوم الدین'' کی وجہ سے۔ تو ابوحنیفہ نے کہا کہ آپ نے (جواب میں) بلی (ہاں کیوں نہیں) کہا؟ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا: ''قال اولم تؤ من قال بلی'' نضر بن محمد فرماتے ہیں: قتادہ غصہ میں کھڑے ہوگئے اور گھر چلے گئے۔ اس کے بعد قسم کھالیا کہ اب کبھی ان سے گفتگو نہیں کروں گا۔ (تاریخ بغداد للخطیب بغدادی، جلد ۱۱، ص ۳۴۸، دارالفکر، بیروت، لبنان)

مذکورہ بالا واقعہ کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کے بعض معاصرین کے دل میں آپ سے حسد فطری بات ہے لیکن اس سے امام اعظم کی بلندیِ قامت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ حدیث کے تعلق سے خط کشیدہ تحریر کو بغور مطالعہ فرمائیے کیا کوئی ایسا شخص جسے حدیث کا علم نہ کے برابر ہو ایسی بات کہہ سکتا ہے؟

علمی اور شخصی حیثیت:

ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ امام اعظم کا علم حدیث میں مقام جاننے کے لیے ہمیں ان کے معاصرین کی آرا کو بھی دیکھنا پڑے گا لیکن ہم پہلے آپ کی شخصی حیثیت کے تعلق سے کچھ گفتگو کریں گے کیونکہ بعض متعصبین نے اس حوالے سے بھی بہت کچھ کہا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کا تعلق طبقہ تابعین سے تھا۔ امام شعرانی طبقات الکبریٰ میں ارشاد فرماتے ہیں:

''کان فی زمنه أربعة من الصحابة أنس بن مالک و عبداللّٰه بن أوفی، وسهل بن سعد، وأبوالطفیل وهو آخرهم موتا ولم یأخذ عن واحد منه.'' (الطبقات الکبری، ص ۸۱، دارالمعرفۃ بیروت، لبنان)

''امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں چار صحابہ تھے: انس بن مالک، عبداللہ بن اوفی، سہل بن سعد اور ابوالطفیل اور ان کا سب سے آخر میں انتقال ہوا ابوحنیفہ نے ان میں سے کسی نے روایت نہیں کی۔''

عبدالحلیم الجندی کا کہنا ہے:

''قالوا رأی النعمان فی حداثتة من الصحابة ثمانیة رجال وإمرأة، وقیل خمسة وإمرأقوقیل خمسة وإمرأتین منهم أنس بن مالک وأنه سمع منه حدیث طلب العلم فریضة علی کل مسلم وحدیث الدال علی الخیر کفاعله، وحدیث اِن اللّٰه تعالیٰ یحب اغاثة اللهفان، وقالو انه لم یسمع من الصحابة أحداوانما تمحضت حداثته لدراسته الکلام.'' (ابوحنیفۃ بطل الحریۃ و التسامح فی الاسلام، عبدالحلیم الجندی، ص ۱۱)

یہاں صحابۂ کرام کی جو تعداد بتائی جارہی ہے وہ آٹھ مرد اور ایک خاتون

ہے۔ کچھ لوگوں نے پانچ مرد اور ایک خاتون کا قول کیا جبکہ بعض کے مطابق پانچ مرد اور دو خواتین ہیں۔ انھیں میں سے انس بن مالک ہیں جن سے آپ کو سماع حدیث کا شرف بھی حاصل ہے۔ **طلب العم فريضة على كل مسلم، الدال على الخير كناعله اور إن الله تعالىٰ يحب اِغاثة اللهفان**، ان حدیثوں کی آپ نے سماعت کی جبکہ کچھ لوگوں نے صحابہ سے آپ کی سماعت کا انکار بھی کیا ہے اور کہا کہ اس میں آپ کی کم عمری مانع رہی۔ پہلی روایت کے اعتبار سے آپ کی معاصرت چار صحابۂ کرام سے رہی جبکہ دوسری روایت کے اعتبار سے نو اور کم از کم چھ صحابہ وصحابیات سے آپ کی معاصرت رہی۔ دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ نے بچپن میں زیادہ سے زیادہ نو اور کم از کم چھ صحابہ کی معاصرت پائی ہو جیسا کہ عبدالحلیم جندی کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے نو یا چھ صحابہ و صحابیات کو 'بچپنے' کے عالم میں دیکھا تھا جبکہ طبقات الکبریٰ میں اس بات کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔ طبقات میں ابوالطفیل رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں یہ صراحت ملتی ہے کہ تمام صحابہ کے آخر میں ان کا انتقال ہوا۔ اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کا انتقال ۱۰۲ ہجری میں ہوا یعنی اس وقت امام اعظم رضی اللہ عنہ کی عمر راجح قول کی بنیاد پر ۲۲ سال رہی ہوگی، ان اعداد وشمار سے اس بات کا امکان سامنے آ رہا ہے کہ آپ نے صحابہ سے حدیث سماعت کی ہوگی۔ پھر آپ کی سماعت کردہ حدیثوں میں سے طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم والی حدیث تو کئی اسناد سے مروی ہے۔ اس سے بھی آپ کی سماعت حدیث والی بات کو تقویت ملتی ہے۔ بہر حال اس سے تو کم از کم ان لوگوں کا تردد تو رفع ہو ہی جانا چاہیے جو آپ کو طبقہ تابعین میں شمار کرنے میں تردد کرتے ہیں۔ خطیب بغدادی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ آپ نے صحابی رسول حضرت انس بن مالک کو دیکھا تھا۔ لکھتے ہیں: "**امام أصحاب الرأى وفقيه أهل العراق رأى أنس بن مالك**." (حاشیہ تدریب الراوی، ص ۴۵، المکتبہ التوفیقیہ مصر، و تاریخ بغداد، ج ۱۱، ص ۲۳۲)

اب ہم آپ کے سامنے آپ کے معاصرین کے درمیان آپ کی علمی حیثیت کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"امام سفیان ثوری نے بڑے لطائف الحیل سے 'کتاب الرہن' کی نقل حاصل کی اور اس کو اکثر پیش نظر رکھتے تھے، زائدہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک دن سفیان کے سرہانے ایک کتاب دیکھی، جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے، ان سے اجازت مانگ کر میں اس کو دیکھنے لگا تو ابوحنیفہ کی کتاب الرہن نکلی، میں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ ابوحنیفہ کی کتابیں دیکھتے ہیں بولے کاش! ان کی سب کتابیں میرے پاس ہوتیں۔ (سیرۃ النعمان، شبلی نعمانی، ص ۱۸۴، بحوالہ عقود الجمان)

تقریباً یہی بات مناقب للکردی میں ہے۔ اس میں اتنا اضافہ اور ہے کہ: "یقیناً انھوں نے علم کی انتہا درجہ کی شرح کی ہے لیکن ہم نے ان سے انصاف نہیں کیا۔ (مناقب للکردی، ترجمہ مقامات امام اعظم، ج ۲، ص ۲۶۶، المجمع المصباحی، مبارک پور، مترجمین علامہ فیض احمد اویسی وغلام محی الدین)

آگے شبلی نعمانی لکھتے ہیں: "یہ بھی کچھ کم تعجب کی بات نہیں کہ باوجود یہ کہ اس وقت بڑے بڑے مدعیانِ فن موجود تھے اور ان میں بعض امام ابوحنیفہ سے مخالفت بھی رکھتے تھے تاہم کسی کو اس کتاب کی ردوقدح کی جرأت نہیں ہوئی۔ (سیرۃ النعمان، شبلی نعمانی، ص ۱۸۴)

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ خود امام اعظم کے بہت بڑے مداح تھے ان کے بارے میں ان کا یہ قول بڑا مشہور ہے:

الناس عيال أبى حنيفة فى الفقه. (الطبقات الکبریٰ، ص ۸۲، دار المعرفۃ بیروت، لبنان، و تاریخ بغداد، ج ۱۱، ص ۲۴۲)

ہارون بن سعید فرماتے ہیں:

"**سمعت الشافعى يقول مارأيت أحدا أفقه من أبى حنيفة.**" (تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۱۱، ص ۲۴۶، دار الفکر بیروت، لبنان)

امام ابو یوسف فرماتے ہیں:

"**مارأيت أحدا اعلم بتفسير الحديث و مواضع النكت فيه من الفقه من أبيى حنيفة.**" (تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۱۱، ص ۲۴۶)

ابو مطیع الحکم بن عبداللہ فرماتے ہیں:

"**مارأيت صاحب يعنى حديث افقه من سفيان الثورى وكان ابو حنيفة أفقه منه.**" (تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۱۱، ص ۲۴۶)

حسن بن علی فرماتے ہیں:

سمعت يزيدبن هارون وساله انسان فقال: يا أباخالد من أفقه من رأيت؟ قال: أبو حنيفة قال الحسن و لقد قلت لأبى عاصم يعنى النبيل. ابو حنيفة أفقه أو سفيان؟ قال أبو حنيفة أفقه من سفيان. (تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۱۱، ص ۲۴۶)

ترجمہ: میں نے یزید بن ہارون سے سنا، جس وقت ان سے کسی نے پوچھا کہ اے ابوخالد! جن لوگوں کو آپ نے دیکھا ہے ان میں سب سے بڑا فقیہ کون ہے تو جواب دیا ابوحنیفہ۔ حسن فرماتے ہیں میں نے ابوعاصم یعنی نبیل سے دریافت کیا کہ ابوحنیفہ زیادہ بڑے فقیہ ہیں یا سفیان تو انھوں نے بتایا کہ ابوحنیفہ سفیان سے بڑے فقیہ ہیں۔ □□

محمد سلیم امجدی ناگوری ☆

شیخ طریقت حضرت سید شاہ نعیم اشرف اشرفی جیلانی

تارک السلطنت، غوث العالم، محبوبِ یزدانی مخدوم سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اپنے عالمی روحانی مشن کے فروغ اور اپنی جانشینی کے لیے اپنے بھانجے حضرت عبدالرزاق نورالعین جیلانی کا انتخاب فرما کر اپنی فرزندی میں لے لیا۔ حضرت نورالعین حضرت محبوب سبحانی غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانی کی دسویں پشت میں آپ کے شہزادے حضرت سید تاج الدین ابوبکر عبدالرزاق جیلانی کی نسل سے ہیں۔ اس طرح آپ نسباً جیلانی اور ارادۃً اشرفی ہوکر مجمع البحرین ہوگئے۔ آپ کی نسل ہی ''خاندان اشرفیہ'' سے معروف ہوئی جس کا سلسلہ آپ کے تین فرزندوں سے چلا۔

(۱) حضرت سید شاہ حسن اشرفی جیلانی

(۲) حضرت سید شاہ حسین اشرفی جیلانی اور

(۳) حضرت سید شاہ حاجی احمد اشرفی جیلانی۔

مؤخر الذکر سے خاندان اشرفیہ جائس ہے جس کے سجادہ نشین 'محبوب یزدانی' کے مؤلف شیخ طریقت حضرت علامہ الحاج سید شاہ نعیم اشرف جیلانی ہیں۔

خانوادہ اشرفیہ کے علما و مشائخ کی شہرت و مقبولیت نیز علمی و روحانی خدمات محتاج بیان نہیں ہیں۔ پچھلی چھ صدیوں میں نامور مشاہیر علما و مشائخ کی اتنی لمبی فہرست اور عظیم کارناموں کا اتنا طویل ریکارڈ، ایک ہی خانوادہ میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہی ایک خصوصیت کافی ممتاز ہے۔ تذکروں میں تقریباً ۲۷ مشاہیر کا ذکر جمیل ملتا ہے۔ بانی ادارۂ فرنگی محل حضرت مولانا نظام الدین فرنگی محلی کے سلسلہ اساتذہ میں حضرت مولانا سید اشرف قلی اشرفی جیلانی جائسی کا نام آتا ہے۔ حضرت مولانا سید باقر اشرفی جیلانی ملقب بہ فاضل جائسی نے علما و اساتذۂ فرنگی محل کے ایما پر شرح عقائد جلالی پر ایک مبسوط حاشیہ تحریر فرمایا تھا جس میں حضرت مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی بعض تحقیقات کے خلاف تحقیق فرمائی تھی جو انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں مطبوع ہوا تھا۔ حتیٰ کہ فرنگی محل کی تاسیس سے صدیوں پیشتر شاہان شرقی کا یہ فرمان اب بھی ریکارڈ میں ہے کہ: ''مملکت میں کسی ایسے فتوے کو صادر نہ کیا جائے جس پر مولانا سید امین اشرف جائسی کے دستخط اور ان کی مہر نہ ہو۔''

گزشتہ صدی میں کچھوچھہ سے اعلیٰ حضرت شاہ علی حسین اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے مخدومی مشن کو عالمگیر وسعت دی، جسے ان کے فرزند حضرت مولانا سید احمد اشرف اشرفی جیلانی کے فضل وکمال اور ان کے جلیل القدر نواسے حضرت مولانا سید محمد اشرفی جیلانی محدث کچھوچھوی کے زور خطابت نے اور فروغ دیا۔ خانوادہ اشرفیہ جائس تقریباً نصف صدی سے عزلت و گمنامی میں رہا تا آنکہ سجادۂ اشرفیہ رزاقیہ احمدیہ پر وہ ذات جلوہ گر ہوئی جس نے خانوادہ اشرفیہ کی شان کو نئی زندگی عطا کی۔ اس شاخ کے چراغ کی ٹمٹماتی لو کو تیز کیا۔ خاندانی وقار کو جلا بخشا، خانقاہی نظام کو برپا کیا۔ محبوب یزدانی کے روحانی و آفاقی پیغام کی اس نشر گاہ کے تاروں کو درست کیا۔ المختصر اس صدی میں جس نے جائس میں احیا کا کارنامہ نہایت اولوالعزمی سے انجام دیا، وسائل کی کمی، مصائب کے ہجوم اور اعداء کی پیہم یورش کے باوجود جس کی نگاہ بلند رہی، سخن دلنواز رہا اور جاں پرسوز رہی، جو تاریکی میں ایک منارۂ نور رہا، جو چراغ سے چراغ روشن کرتا رہا۔ اس ذات گرامی کا نام نامی ہے سید نعیم اشرف اشرفی جیلانی ہے، جو ''محبوب یزدانی'' کتاب کے مؤلف بھی ہیں اور مخدومی مشن کے داعی اور مبلغ بھی۔

شیخ طریقت سید شاہ نعیم اشرف سجادہ نشین خانقاہ اشرفیہ جائس ۱۹/اپریل ۱۹۲۵ کو اپنے نانا عارف باللہ سید شاہ علی نقی اشرف اشرفی حسنی سجادہ نشین جائس کے گھر پیدا ہوئے۔ علمی وروحانی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے۔ فراغت وآسودگی کی فضا میں پرورش ہوئی۔ حضرت کے نانا بلند پایہ عالم نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ حضرت کی دوسری صاحبزادی سیدہ آل فاطمہ حضرت مؤلف کی والدہ تھیں جو نہایت تقویٰ شعار عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ ان کی شادی حضرت سید شاہ قیوم اشرف اشرفی جیلانی حسنی سے ہوئی جو بڑے پرہیزگار اور مقبول ومستجاب تھے۔ آپ بھی حضرت شاہ حاجی احمد جائسی کی نسل سے تھے مگر ان کی کئی پشتیں کچھوچھہ میں مقیم تھیں اور وہیں ان کا آبائی مکان تھا لیکن وہ اپنے خسر محترم کی خواہش پر جائس آ گئے انہیں دونوں بزرگوں سے یہ چوکھٹ آباد ہوئی۔ سجادگی کی رونق بڑھی اور بوستان اشرفی میں بہار آئی۔

حضرت شیخ طریقت کی رسم تسمیہ خوانی آپ کے نانا شاہ علی نقی اشرفی جیلانی سجادہ نشین نے خود فرمائی اور انہوں نے آپ کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ فرمائی۔ چھ سال کی عمر میں ناظرہ قرآن شریف ختم کیا اور اسی عمر میں نماز کا طریقہ اور متعدد آیات شفا اور دعائیں یاد کرائی گئیں۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم حضرت نانا جان سے ہوئی۔ فارسی کی بقیہ کتابیں حکیم احمد اشرف جائسی، حکیم سید مبارک حسین اشرفی جیلانی جائسی اور قاضی میر محمد جائسی سے پڑھیں۔ درس

☆ صدر المدرسین دار العلوم جائس درگاہ مخدوم اشرف جائس، رائے بریلی salimamjadi@gmail.com

نظامی کی تعلیم مولانا غلام مصطفیٰ وارثی جائسی، علامہ عبدالعزیز خاں فتح پوری اور علامہ مفتی رفاقت حسین صاحب اشرفی سے حاصل کی۔ مولانا عبدالعزیز خاں صاحب نے حضرت کو کافیہ زبانی یاد کرادی تھی اس زمانے میں آپ کو ٹائیفائڈ بخار ہوا جس کے زیراثر آپ کافیہ کی عبارتیں پڑھنے لگے۔ والدہ صاحبہ سخت پریشان ہوئیں کہ پڑھ تو رہے ہیں عربی لیکن نہ تو قرآن شریف ہے اور نہ دلائل الخیرات چنانچہ انھوں نے اپنے عم زاد حکیم مولانا سید حسن اشرف کو بلایا وہی معالج بھی تھے تو انھوں نے تسلی دی کہ یہ زیر درس کتاب ہے جسے اس کیفیت میں پڑھ رہے ہیں۔

آپ کے اکتساب علم کا نقطۂ عروج اس وقت آیا جب آپ کو حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی کی رفاقت حاصل ہوئی۔ حضرت موصوف جائسی رشتے سے آپ کے ماموں اور کچھوچھوی رشتے سے خسر تھے۔ حضرت خود فرماتے ہیں کہ رفاقت وتلمذ کے یہ دو سال میرے لیے نہایت گراں بہا رہے ہیں۔

۱۹۳۷ء میں اپنے نانا اور مربی سید شاہ تقی اشرف سجادہ نشین سے بیعت ہوئے۔ مرشد برحق نے ان کے لیے نشست وبرخاست اور معمولات وعبادات کا ایک پورا لائحۂ عمل تیار کر کے دیا، اور حضرت نے پورے استقلال کے ساتھ اس کی بجا آوری کی۔ انہیں ان کے نانا ہمیشہ یاد دلاتے رہتے تھے کہ اس طرح رہنے کے خوگر ہو کہ کہیں اور کسی وقت بھی تم کو دیکھنے والے کو افسوس اور تمہیں شرمندگی نہ ہو۔ ۱۹۴۷ء میں آپ کے نانا سخت علیل ہوئے۔ مریدین بکثرت مزاج پرسی کے لیے آتے تھے تو آپ سب سے فرماتے کہ میرے بعد سجادہ نشین میرے نواسے نعیم اشرف ہوں گے۔ علالت کے اس دور میں حضرت نے زیادہ تر وقت اپنے مرشد ومربی کے قرب میں گزارا اور اگر کسی وجہ سے غیر حاضر ہوئے تو فوراً طلب کیے جاتے۔ نانا نے اپنے عزیز ترین نواسے کو اپنی گراں بہا عمر فیض بخش کے آخری ایام میں خوب خوب نوازا۔ مرشد ومربی کی روحانی تربیت وعطا کا یہ نقطۂ عروج تھا اور اس درمیان ایک روز بڑی تعداد میں مریدین اور اہل خاندان کی موجودگی میں اور جمعہ کی مبارک ساعت میں حضرت کو اپنی اجازت وخلافت سے نوازا اور اسی سال ۵؍رمضان المبارک کو اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ آپ کے بعد حضرت شیخ طریقت سجادہ اشرفیہ پر متمکن ہوئے۔ اس وقت حضرت کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ تصوف کی کتابوں سے آپ کو ہمیشہ شغف رہا جن میں سرفہرست، لطائف اشرفی، مکتوبات اشرفی، مکتوبات امام ربانی، کشف المحجوب، عوارف المعارف، فوائد الفواد، احیاء علوم الدین، شفاء شریف، مدارج النبوہ اور مثنوی مولانا روم وغیرہ ہیں۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں حضرت کا رشتہ مناکحت عارف باللہ سید شاہ محی الدین اشرفی جیلانی عرف اچھے میاں کی صاحبزادی سے کچھوچھہ شریف میں ہوا۔ آپ کے خسر، حضرت سید اشرف حسین صاحب (مجدد سلسلہ اشرفیہ) کے پوتے اور آپ کی خوش دامن صاحبہ ان کے برادر خورد حضرت اشرفی میاں کی پوتی تھیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے مفکر اسلام سید محمد اشرف کلیم اشرفی جیلانی ولی عہد سجادہ ہیں۔ (موجودہ سجادہ نشین) جن کی دعوت وخطابت کی چہار سو دھوم ہے۔ دوسرے صاحب زادے سید فہیم اشرف ہیں جو لاگریجویٹ ہیں۔ تیسرے صاحبزادے سید ندیم اشرف، گزشتہ حکومت میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے چیئرمین اور ریاستی وزیر کے عہدے پر فائز تھے۔ چوتھے بیٹے ڈاکٹر سید علیم اشرف، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں شعبہ عربی سے منسلک ہیں۔ پانچویں بیٹے سید قسیم اشرف عرف حسن میاں ہیں جو دار العلوم جائس کے مہتمم ہیں۔ آخری صاحبزادے سید شمیم اشرف، اشرف کنسٹرکشن پرائیویٹ لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ حضرت کی ایک صاحب زادی ہیں جو راقم السطور سے منسوب ہیں۔

حضرت شیخ طریقت کا طریقۂ رشد وہدایت نہایت سادہ مگر دلنشین ہے اسلوب بیان انتہائی بلیغ وپراثر ہوتا ہے۔ آپ کی گفتگو نہایت پرمغز شستہ اور فکر انگیز ہوتی ہے۔ آپ کی مجلس میں بیٹھنے والا خود کو ہی حضرت کا مخاطب سمجھتا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے اور امیر وغریب کی جانب یکساں التفات رہتا ہے۔ اہل علم کو خصوصی توجہ ملتی ہے۔ حسن اخلاق کا مجسم نمونہ ہیں اور گفتگو کا محور بھی اکثر حسن اخلاق رہتا ہے۔ ظاہر شریعت پر خود پابندی سے عمل فرماتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید فرماتے ہیں۔ خانقاہوں اور درگاہوں کے فساد اور اہل خانقاہ کی بے عملی اور شریعت سے دوری کو سخت ناپسند فرماتے ہیں، اور بارہا اس کا ذکر فرماتے ہیں۔

ایک مرتبہ خانقاہ شریف 'زاویۃ النعیم' میں مشہور صحافی جناب طیش صدیقی صاحب نے حضرت سے ایک انٹرویو لیا تھا جس میں حضرت نے بڑے ہی دلنشیں انداز میں تصوف کی حقیقت وماہیت، صوفیہ کی خدمات وتعلیمات اور اس کے آثار وبرکات کا تفصیلی طور پر ذکر کیا ہے۔ اموی جور وستم ہو یا اکبری فتنۂ تصوف نے ہی ظلم والحاد کی ہر آندھی سے اسلام کے چراغ کی حفاظت کی ہے۔ داخلی فتنوں کے ساتھ ساتھ بیرونی حملوں کا مقابلہ بھی تصوف اور صوفیہ ہی نے کیا، یہی وہ مقدس جماعت تھی جس نے تاتاری صنم خانوں سے کعبے کو پاسبان مہیا کیے۔ حضرت کا یہ انٹرویو بے حد بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے۔ (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ)

❑❑

غوث سیوانی ☆

تصوف اور فقر

اپنی روزمرہ کی زندگی میں انسان کو روپے پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کے بغیر کاروبارِ حیات نہیں چل سکتے مگر ضرورت سے زیادہ دولت اور عیش وعشرت کی ہوس اسے مادہ پرست بنا دیتی ہے۔ وہ آخرت سے بیزار اور دنیا سے محبت کرنے والا ہوجاتا ہے۔اس دولت کو جمع کرنے کے لیے وہ نہ جانے کیا کیا صحیح اور غلط طریقے اپناتا ہے۔دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے، جھوٹ اور فریب کا سہارا لیتا ہے۔نتیجہ کے طور پر وہ حقوق العباد میں خیانت کا گنہگار ہوکر بارگاہ خداوندی میں قابلِ گرفت قرار پاتا ہے۔یہ مال انسان کو اس کے خالق اور آخرت سے دُور کردیتا ہے، یہی سبب ہے کہ صوفیہ اپنی زندگی فقر میں گزارتے ہیں۔وہ اسے پسند کرتے ہیں، دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے ہیں اور مال جمع کرنا ان کے مزاج کے خلاف ہوتا ہے۔حالانکہ بعض اہلِ تصوف ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے خوب دولت کمائی، بڑی تجارت کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنی دولت سے ایک دنیا کو مستفید ومستفیض کیا مگر ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی۔جن صوفیہ نے دنیا کے مال سے احتراز کیا ان کی نظر میں مال کے منفی پہلو تھے اور اس کی وجہ سے حبِّ دنیا پیدا ہونے کے اندیشے تھے، اور جن صوفیہ نے مال ودولت کمایا ان کے یہاں اس کا مقصد بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچانا تھا۔جن کے پاس دولت تھی وہ اسے صدقہ وخیرات پر خرچ کرتے تھے۔فقرا ومساکین کی دستگیری کرتے تھے۔علما اور طلبہ کی کفالت کرتے تھے اور مال ہوتے ہوئے بھی مال کی محبت اور مادہ پرستی سے سینکڑوں میل دُور تھے۔

فقر کا مطلب:

اہلِ تصوف کا مزاج ہمیشہ الفقر فخری والا رہا ہے۔امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ فقر کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں۔

’’فقر کا مطلب اس چیز کا نہ ہونا ہے جس کی حاجت ہو، لیکن جس کی حاجت نہ ہو اس کا نہ ہونا فقر نہیں کہلاتا اور اگر وہ چیز جس کی حاجت ہے موجود بھی ہو اور انسان کے بس میں بھی ہو تو وہ فقیر نہیں کہلاتا۔‘‘ (ترجمہ احیاء العلوم،ص ۴۲۶)

فقیر کا مفہوم کیا ہے اور ایک صوفی کو فقیر کیوں ہونا چاہیے؟ اس تعلق سے سیّد علی ہجویری علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

’’فقیر ودرویش وہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو اور کوئی چیز اسے خلل انداز نہ کرے۔وہ اسباب دنیا کی موجودگی سے غنی ہو اور نہ اس کے نہ ہونے سے محتاج ہو۔اسباب کا ہونا اور نہ ہونا دونوں اس کے فقر میں یکساں ہیں، بلکہ اسباب کی غیر موجودگی میں زیادہ خوش وخرم رہتا ہو۔جواز کی ایک حالت یہ ہے، اس لیے مشائخ نے فرمایا ہے کہ درویش جس قدر تنگدست ہوگا اس کا حال اتنا ہی کشادہ ہوگا، کیونکہ درویش کے نزدیک اسباب دنیاوی کا ظاہری وجود بھی تنگ دلی کا موجب ہوتا ہے۔حتیٰ کہ وہ کسی چیز کا دروازہ بند نہیں کرتا۔اگر بند کرے تو اتنا ہی اس کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔لہٰذا حق تعالیٰ کے اولیا اور اس کے محبوبوں کی زندگیاں الطاف خفی میں چھپی ہوتی ہیں اور حق تعالیٰ کے ساتھ روشن اسرار بہتر ہوتے ہیں نہ کہ دنیا کے عزار کی مصاحبت۔چونکہ یہ دنیا نافرمانوں کی جگہ ہے۔اس کے اسباب سے تعلق رکھنا صحیح نہیں ہوسکتا ہے اسی لیے یہ حضرات رضائے الٰہی کی راہ میں دنیاوی ساز وسامان سے کنارہ کشی کی تعلیم دیتے ہیں۔‘‘ (کشف المحجوب،ص-۵۱)

صوفیہ ترک مال اور تجرد کو اللہ کی قربت کا ذریعہ تصور کرتے ہیں، اسی لیے اس پر زور دیتے ہیں اور دنیا کی محبت کی ایک قسم وہ حبِّ مال کو سمجھتے ہیں لہٰذا وہ اس سے دور رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔

فقر کی پانچ حالتیں:

صوفیہ کے نزدیک اصل فقر یہ ہے کہ مال کا ہونا اور نہ ہونا انسان کے لیے برابر ہوجائے، بلکہ مال کے نہ ہونے میں اسے زیادہ خوشی اور مسرت کا احساس ہو۔امام محمد غزالی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں فقر پر پورا باب رکھا ہے، وہ اسے پانچ حالتوں میں تقسیم کرتے ہیں:

’’پہلی حالت: جو سب سے بلند ہے یعنی جب اس کے پاس مال آئے تو وہ اسے ناپسند کرے اور اس سے اذیت محسوس کرے اور اسے قبول کرنے سے بھاگے، نیز اس کے شر اور اس میں مشغولیت سے بچے، یہ زہد ہے اور ایسے شخص کو زاہد کہتے ہیں۔

دوسری حالت: مال میں رغبت نہ ہو کہ اس کے ملنے پر خوش ہو اور نہ اس طرح ناپسند کرتا ہو کہ اس سے اذیت حاصل ہو تو چھوڑ دے، ایسی حالت والے کو راضی کہتے ہیں۔

تیسری حالت: مال کے نہ ہونے کے مقابلے میں اس کا پایا جانا اسے پسند ہو کیونکہ وہ اس میں رغبت رکھتا ہے، لیکن اس کی محبت اس حد تک نہیں پہنچتی کہ اس کی طلب میں سرگرمی دکھائے، بلکہ اگر آسانی سے مل جائے تو خوش ہوتا ہے اور اس کی تلاش میں محنت کرنا پڑے تو اس میں مشغول نہیں ہوتا ایسے شخص کو قانع صبر کرنے والا کہتے ہیں۔اس لیے کہ اس نے موجود پر قناعت کی حتیٰ کہ اس کی

☆ ای میل:ghaussiwani@gmail.com، موبائل:9312976216

طلب کو چھوڑ دیا باوجود یہ کہ کچھ کمزور سی رغبت بھی تھی۔

چوتھی حالت: عاجزی کی وجہ سے مال کی طلب چھوڑ دے ورنہ اس میں ایسی رغبت رکھتا ہے کہ اگر اس کی طلب تک راستے ملے اگر چہ تھکاوٹ کے ساتھ ہو تو وہ اسے طلب کرے یا اس کی طلب میں مشغول ہو تو ایسی حالت والے کو حریص کہتے ہیں۔

پانچویں حالت: اس کے پاس جو مال نہیں ہے وہ اس کی طرف مجبور ہو جیسے بھوکا شخص جس کے پاس روٹی نہ ہو اور برہنہ شخص جس کے پاس کپڑا نہ ہو، اسے شخص کو مضطر کہتے ہیں۔'' (ص ۴۲۸-۴۲۷)

اہلِ تصوف کی نظر میں فقر کی سب سے اعلیٰ قسم زہد ہے، جسے امام غزالی علیہ الرحمہ نے پہلی قسم قرار دیا ہے، مگر اس سے بھی بلند ایک قسم ہے، ایسی حالت والے کو مستغنی کہا جاتا ہے۔ یعنی مال واسباب کا ہونا اور نہ ہونا اس کے لیے برابر ہو۔ امام محمد غزالی علیہ الرحمہ اس کے لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حالت کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں یعنی ان کے پاس ایک لاکھ درہم بہ طور عطیہ آئے تو آپ نے لے لیے اور اسی دن تقسیم کر دیا۔ خادمہ نے عرض کیا اگر ان میں سے ایک درہم کا گوشت لے لیتیں تو اس سے روزہ افطار کر لیتے۔ آپ نے فرمایا اگر پہلے یاد دلاتیں تو ایسا ہی کرتی۔

فقر کی فضیلت:

صوفیہ اپنے فقر اختیاری کے لیے قرآن اور احادیث سے دلیلیں لاتے ہیں۔ وہ اس کے لیے خاص طور پر اصحاب صفہ کی زندگی کو پیش کرتے ہیں، جو مسجد نبوی کے قریب ایک چبوترے پر رہا کرتے تھے۔ ان کا کام رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سے فائدہ حاصل کرنا اور صبر و توکل سے فقر کی حالت میں رہنا تھا۔ کچھ ایسے اصحاب بھی تھے جو صفہ میں نہیں رہتے تھے مگر ان کی زندگی اصحاب صفہ کی طرح ہی فقر و زہد کی تھی۔ اہلِ تصوف اپنے فقر اختیاری کے لیے مختلف قرآنی آیات پیش کرتے ہیں جیسے امام محمد غزالی نے احیاء العلوم اور داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری نے کشف المحجوب میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۳ کو پیش کیا ہے۔

''ان فقراء کے لیے جن کو راستے میں روکا گیا وہ زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔''

امام محمد غزالی اس فقر کی فضیلت میں کئی احادیث نبویہ پیش کرتے ہیں۔ ایک حدیث جو کنز العمال کی ہے وہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ سے فقر کی حالت میں ملاقات کرنا، غنی ہونے کی حالت میں نہیں۔'' (اُردو ترجمہ احیاء العلوم، ص ۴۳۴)

دوسری حدیث:

''بیشک اللہ تعالیٰ اس فقیر کو پسند کرتا ہے جو عیالدار ہونے کے باوجود اپنا دامن بچاتا ہے۔'' (ایضاً)

تیسری حدیث جو مسند امام احمد بن حنبل کی ہے:

''میری امت کے فقراء مالداروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے۔'' (ایضاً)

اسی طرح داتا گنج بخش سیّد علی ہجویری علیہ الرحمہ نے بھی فقر کی فضیلت میں کئی حدیثیں نقل کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ روز قیامت اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا، میرے محبوبوں کو میرے پاس لاؤ۔ فرشتے عرض کریں گے، کون تیرے محبوب ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، وہ مسکین و فقراء ہیں۔'' (ص ۴۹)

اہلِ تصوف میں بیشتر حضرات نے پہلے فقر اختیار کیا اور پھر اسی پر صبر و توکل کے ساتھ قائم رہے۔ حالانکہ اصحاب رسول میں جس طرح بعض حضرات تنگدست اور بعض تونگر تھے اسی طرح صوفیہ میں بھی تھے اور یہاں جو تونگر تھے وہ بھی تونگر صحابہ کی طرح ہی سخی اور فراخ دل تھے۔ ان کی دولت کے دروازے ضرورت مندوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ بعض اصحاب تصوف تو ایسے بھی گزرے ہیں جن کے پاس حکومت اور سرداری تھی، مگر جب انھوں نے خود کو خدا کے لیے وقف کر دیا تو حکومت اور دنیاوی جاہ وحشم کو خیرآباد کہہ دیا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی ایسے ہی صوفیہ میں شامل تھے۔ ایسے اربابِ تصوف کی بھی کمی نہیں جن کے دروازوں پر اربابِ حکومت کی قطاریں لگی ہوتی تھیں، جیسے حضرات خواجہ ابوالحسن خرقانی، شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت نصیر الدین چراغ دہلی وغیرہ، مگر انھوں نے کبھی دولت دنیا کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

فقر اربابِ تصوف کی نظر میں:

اربابِ تصوف کی نظر میں فقر کا بلند مقام ہے اور اس پر صبر و توکل کو وہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ وہ اس شخص کو راہ سلوک کا راہی تصور ہی نہیں کرتے جس میں فقر نہ ہو یا فقر پر صبر و رضا نہ اختیار کرے۔ ہندوستان میں تصوف کے بانیوں میں سے ایک شیخ علی ہجویری علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں:

''بارگاہ احدیت میں فقراء کا بڑا مقام و درجہ ہے۔ خدا نے ان کو خاص منزلت و مرحمت سے نوازا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسباب ظاہری و باطنی سے ترک تعلق کر کے مکمل طور پر مسبب الاسباب پر قناعت کر کے رہ گئے ہیں اور اپنے

آپ کو خدا کی ملازمت اور اس کی بندگی کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ان کا فقر ان کے لیے موجب فخر بن گیا ہے اور فقر کی دوری پر آہ وزاری اور اس کی آمد پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ حضرات فقر و مسکینی سے ہمکنار رہتے ہیں اور اس کے سوا ہر چیز کو ذلیل وخوار جانتے ہیں۔'' (کشف المحجوب، صفحہ-۵۰)

حضرت ابراہیم بن احمد خواص علیہ الرحمہ نے فقر کی فضیلت میں جو الفاظ کہے ہیں وہ تصوف کی کتابوں میں بہت نمایاں ہیں اور ان الفاظ کو پڑھ کر لگتا ہے کہ دنیا میں سب سے افضل واعلیٰ کام فقر اختیار کرنا ہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''فقر صاحب مجد وشرف کی چادر، پیغمبروں کا لباس، صالحین کی کوشش اور پرہیزگاروں کا تاج ہے۔ مومنین کی زینت، عارفین کی کمائی اور مریدین کی آرزو ہے۔ اطاعت گزاروں کا قلعہ اور گنہگاروں کا قید خانہ ہے۔ یہ گناہوں کو دور کرنے والا، نیکیوں کو بڑھانے والا، درجات کو بلند کرنے والا اور مقصود تک پہنچانے والا ہے۔ خدائے جبار کی رضا ہے اور اس کے نیک ولیوں کی ایک کرامت ہے۔'' (کتاب اللمع، ص ۴۸-۴۷)

امام قشیری بھی صوفیہ کو اللہ کے برگزیدہ بندوں میں شمار کرتے ہیں۔ وہ فقراء کا تذکرہ انبیاء کے ساتھ کرتے ہیں اور الرسالۃ القشیر یہ میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں کے ذریعے مخلوق کی حفاظت کرتا ہے اور انھیں کی برکت سے انھیں رزق دیتا ہے۔ اسی طرح دیگر اہل تصوف بھی فقر کو ایک صوفی کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ اس کے بغیر تصوف اور روحانیت کو نامکمل تصور کرتے ہیں۔ دراصل تصوف میں انسان کو مکمل طور پر روحانی بنایا جاتا ہے۔ اس کی توجہ کو کائنات کی طرف سے پھیر کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ تصوف کے راستے پر چلنے والا مال سے قطع تعلق کرلے اور دنیا سے بالکل بے رغبت ہو جائے۔ اگر انسان کے اندر دنیا کی اشیاء اور مادیت سے محبت باقی ہوگی تو وہ خود کو پوری طرح خدا کی یاد میں محو نہیں کر پائے گا لہٰذا پہلے اسے فقر وتجرد کا سبق دیا جاتا ہے، پھر وہ صبر و توکل کے راستے پر چلتا ہے اور اسے اس بات کا یقین کامل ہونے لگتا ہے کہ رازق صرف اور صرف اللہ ہے۔ ربوبیت بس اسی کی ہے۔ جو مالک زمین کی تہوں کے اندر اپنی مخلوقات کو رزق پہنچاتا ہے، جو سمندر کی گہرائی میں ربوبیت کا مظاہرہ کرتا ہے اور پہاڑوں کی چٹانوں میں جاندار پیدا کرتا ہے، انھیں پالتا پوستا ہے اور رزق دیتا ہے وہ انسان کو کیوں نہیں دے گا؟ اب ایک صوفی کا یقین خدا کی ذات میں پختہ ہونے لگتا ہے۔

فقر منزل نہیں:

فقر دراصل منزل نہیں بلکہ یہ صوفیہ کے لیے منزل تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ یہ خدا سے تعلق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ انسان کو روحانی سکون عطا کرتا ہے اور کم سے کم اسباب دنیا کے ساتھ اسے جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ صوفیہ دنیا کے اسباب میں سے صرف اتنا ہی لیتے ہیں جس سے کم لیا جانا جائز نہیں۔ صوفیہ فقر و مسکینی میں ہی انسان کی عظمت دیکھتے ہیں۔ حضرت سیّد علی ہجویری علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں:

''فقر و مسکینی کی نرالی شان ہے اور اس کی رسم عجیب ہے اضطرار ہے۔ اس کی حقیقت اقبال اختیاری یعنی بخندہ پیشانی افلاس واضطرار کو قبول کرنا ہے۔ جس نے اس ملک وطریق کو دیکھا اور سمجھا اس نے اس سے آرام پایا۔ جب مراد پائی تو حقیقت سے ہمکنار ہو گئے اور جو حقیقت سے ہمکنار ہو گیا وہ موجودات سے دست کش ہو گیا۔ رویت کل میں فنائے کلی حاصل کر کے بقائے کلی سے سرفراز ہو گیا۔'' (اُردو ترجمہ کشف المحجوب، ص-۵۰)

اہل تصوف کے لیے جہاں فقر و درویشی خدا تک رسائی کا ذریعہ ہے، روحانی سکون کے حصول کا سبب ہے وہیں اس سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور اس سے ظاہری و باطنی روحانیت حاصل کرتا ہے۔ کشف المحجوب کی ایک عبارت یہاں نقل کرنا بیجا نہ ہوگا:

''فقیر کی عزت اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل حرکتوں سے بچائے رکھے اور اپنے حال کو خلل سے محفوظ رکھے۔ نہ بدن معصیت وذلت میں مبتلا ہو نہ جان پر خلل وآفت کا گزر ہو۔ درویش کی ظاہری حالت، ظاہری نعمتوں میں مستغرق اور باطنی حالت، باطنی نعمتوں سے آراستہ ہوتی ہے، تاکہ اس کا جسم روحانیت اور اس کا دل ربّانی انوار کا منبع بن جائے۔ نہ خلق سے اس کا تعلق ہو اور نہ آدمیت سے اس کی باطنی نسبت۔ یہاں تک کہ وہ خلق سے تعلق اور آدمیت کی نسبت سے بے نیاز ہو جائے اور اس جہان کی ملکیت اور آخرت کے درجات کی خواہش سے دل کو تونگری حاصل نہ ہو، اور یہ جانے کہ اس کے فقر کے ترازو کے پلڑے میں دونوں جہاں مچھر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ درویش کی ایسی حالت کے بعد اس کا ایک سانس بھی دونوں جہان میں نہ سما سکے گا۔'' (ص-۵۲)

داتا گنج بخش علیہ الرحمہ نے مندرجہ بالا عبارت میں جس کیفیت کا ذکر کیا ہے اسی کو صوفیہ کی حالت کہتے ہیں کہ انسان ساری خدائی سے بے نیاز ہو جائے اور صرف خدا سے لو لگائے۔ اس حالت میں اسے نہ دنیا کی کسی چیز سے تعلق ہو اور نہ آخرت کی نعمتوں کو خاطر میں لائے، وہ بس رضائے الٰہی کے لیے سب کچھ تج دے:

اتنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہوا
اور اس سے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہوا

❑❑

تحقیقی مقالہ

ابو اُسامہ ظفر القادری بکھروی (پاکستان)

حضرت اُم کلثوم بنت علی کے نکاح کی تحقیق

اہل سنت و جماعت کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اللہ رب العزت جل جلالہ اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر انبیا و رُسل سے محبت کرتے ہیں۔ دیگر تمام انبیا و رُسل علیہم السلام کے مقام و مرتبہ کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں۔ اہل بیت اطہار و ازواج مطہرات کے فضائل و مناقب کو مانتے ہوئے ان سے محبت کو ایمان کی نشانی سمجھتے ہیں۔ اور اسی طرح تمام صحابۂ کرام کی عقیدت و محبت کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں۔ مگر شروع ہی سے جب سے رافضیوں کا جنم ہوا وہ انبیا و رُسل و ازواج مطہرات اور صحابۂ کرام کے فضائل و مناقب کا انکار کرتے آئے ہیں۔ اور اُن کے دل ہمیشہ سے ان حضرات کے بارے میں بغض و عناد سے بھرے رہے ہیں۔

اسی بغض و عناد کے سلسلے کی ایک کڑی سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نکاح حضرت اُم کلثوم بنت حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کہ خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی سگی بیٹی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سگی نواسی ہیں سے ہوا۔ اس نکاح کا انکار رافضی اور شیعہ نواز سُنی کرتے ہیں۔ جیسے محمود شاہ ہزاروی اور اُن کے حواری اور وہ تمام لوگ جو اُن سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہیں۔ اسی طرح وہ نام نہاد محققین و علما جو کسی نہ کسی طرح رافضیوں سے متاثر ہیں۔ وہ بھی انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا اہل سنت و جماعت اور رافضیوں کی مستند کتب سے اس کا ثبوت حاضر ہے۔

اہل سنت وجماعت کی کتب سے نکاح اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا ثبوت:

(۱) حدثنا عبدان، اخبرنا عبد اللّٰہ، اخبرنا یونس، عن ابن شہاب، قال ثعلبۃ بن ابی مالک انّ عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ قسم مروطا بین نساء من نساء المدینۃ فبقی مرط جیّد فقال لہ بعض من عندہ یا امیر المؤمنین أعط ھذا ابنۃ رسول اللّٰہ ﷺ التی عندک یریدون اُم کلثوم بنت علی فقال عمر ام سلیط احق وام سلیط من نساء الانصار ممن بایع رسول اللّٰہ ﷺ قال عمر فانھا کانت تزفر لنا القرب یوم احد۔

(ترجمہ) ثعلبۃ بن ابی مالک بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ مدینہ منورہ کی عورتوں میں چادریں تقسیم فرمائیں، ایک چادر بچ گئی، حاضرین میں سے کسی نے کہا اے امیر المومنین! چادر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی کو دے دیں جو آپ کے عقد میں ہے۔ اس سے اس کی مراد اُم کلثوم بنت علی تھی۔ اُس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اُم سلیط اس کی زیادہ حق دار ہیں۔ اُم سلیط ایک انصاری عورت تھی جس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا کہ یہ اُم سلیط رضی اللہ عنہا وہ عورت ہے جو احد کے دن پانی کی مشکیں بھر بھر کر ہم مجاہدوں کو پلاتی رہی۔ (صحیح بخاری ۴/۴۰، رقم الحدیث ۲۸۸۱ باب حمل النساء القرب الی الناس فی الغزو مطبوعہ دار الشعب قاہرہ ۱۹۸۷ء)

تشریح حدیث:

(۱) امام ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس حدیث پاک کی شرح میں لکھتے ہیں:

''(قولہ یریدون ام کلثوم) کان عمر قد تزوج ام کلثوم بنت علی وامھا فاطمۃ ولھذا قالوا لھا بنت رسول اللّٰہ ﷺ وکانت قد ولدت فی حیاتہ وھی اصغر بنات فاطمۃ علیھا السلام.''

(ترجمہ) سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور سیدۃ فاطمۃ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں۔ اسی لیے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کہا گیا۔ آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ہی پیدا ہو چکی تھیں اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی آپ سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں۔

(فتح الباری ابن حجر عسقلانی ۶/۸۰ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت ۱۳۸۹ھ)

(۲) علامہ احمد قسطلانی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

''(ھذا ابنۃ رسول اللّٰہ ﷺ التی عندک یریدون) زوجتہ (ام کلثوم) بضم الکاف والمثلثۃ (بنت علی) وکانت اصغر بنات فاطمۃ الزھرا واولاد بنا تہٖ علیہ السلام ینسبون الیہ.''

(ترجمہ) حاضرین کا بنت رسول اللہ کہنے سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی سیدہ ام کلثوم بنت علی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادیوں کی اولاد خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوگ منسوب کیا کرتے ہیں۔ (ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری ۵/۸۴ تحت رقم الحدیث ۲۸۸۱ باب حمل النساء القرب الی الناس فی لغزو مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ)

(۳) کنز العمال ۱۳/۲۶۴، رقم الحدیث ۳۷۵۸۷ مطبوعہ حلب میں ہے:

''عن ابی جعفر ان عمر بن الخطاب خطب الی علی بن ابی طالب ابنتہ ام کلثوم فقال علی انما حبست بناتی علی بنی جعفر فقال عمر الکحنیھا یا علی فواللّٰہ ما علی ظھر الارض رجل یرصد من حسن صحابتھا ما ارصد فقال علی قد فعلت فجاء عمر الی مجلس المھاجرین بین القبر والمنبر وکانوا یجلسون ثم علی و

عثمان والزبیر والطلحة وعبد الرحمن بن عوف فاذا کان الشیئ یاتی عمر بن الخطاب من الأفاق جاء هم فاخبر هم بذالک فاستشارهم فیه فجآء عمر فقال رفئونی فتوفنوه وقالوا بمن ؟یا امیر المومنین قال یا بنت علی بن ابی طالب ثم انشاء یخبرهم فقال انّ النبیّ ﷺ قال کل سبب و نسب منقطع یوم القیامة الا سببی و نسبی و کنت قد صحبته فاحببت ان یکون هذا ایضاً۔

(ترجمہ) حضرت ابوجعفر سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کی صاحبزادی سیدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا عقد طلب کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اپنی بیٹیوں کو اولادِ جعفر کے لیے روک رکھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا: اے علی مجھے یہ رشتہ دے دو۔ خدا کی قسم! روئے زمین پر مجھ جیسا کوئی شخص اس (اُم کلثوم) سے حسن سلوک کرنے والا نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا اچھا تو میں نے نکاح کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مہاجرین کی مجلس کی طرف تشریف لائے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور اور منبر شریف کے درمیان جگہ قائم تھی۔ ان حضرات میں حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب بھی زمین کے کسی کونے سے کوئی چیز پہنچتی تو وہ ان کے پاس اسے لے کر حاضر ہوتے۔ ان سے مشورہ کرتے۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور فرمایا! مجھے مبارک دو! پوچھا گیا کس چیز کی مبارک دیں! فرمایا: علی کی صاحبزادی (کے نکاح کے ہو جانے) کی۔ پھر پورا واقعہ سنانا شروع کیا، اور یہ بھی فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت میں ہر حسب و نسب منقطع ہو جائے گا لیکن میرا حسب و نسب وہاں بھی قائم رہے گا۔ مجھے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کا مرتبہ تو مل گیا ہے اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کے نسب سے بھی تعلق قائم ہو جائے۔

اسی طرح اہل سنت کے کثیر محدثین و محققین و مؤرخین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حضرت اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح کا تذکرہ کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے درج ذیل کتب:

(۱) تاریخ خمیس ۲/۱۸۵ (۲) اسد الغابۃ ۲/۳۰۵ (۳) تاریخ طبری ۵/۱۶ (۴) تاریخ کامل ابن اثیر ۳/۵۴ (۵) البدایہ والنہایہ ۷/۱۳۹ (۶) تفسیر ابن کثیر ۵/۴۹۶ (۷) انساب القرشیین لابن قدامہ صفحہ نمبر ۱۱۱، اُم کلثوم بنت علی (۸) کتاب نسب قریش، ص ۴۱ مطبوعہ مصر (۹) جمہرۃ الانساب العرب لابن حزم ص ۳۸ (۱۰) کتاب المحبر صفحہ ۵۶ ذکر اصہار علی (۱۱) کتاب الانساب الاشراف (البلاذری) ۱/۴۲۸ (۱۲) الصواعق المحرقۃ صفحہ ۱۵۷، ۱۵۶ (۱۳) فتح القدیر ۲/۴۲۱ مطبوعہ مصر (۱۴) الشرف المؤبد لآل محمد، صفحہ ۳۹ مطبوعہ مصر (۱۵) المعارف لابن قتیبہ صفحہ ۹۲ مطبوعہ کراچی (۱۶) مصنف ابن ابی شیبہ ۴/۱۹۰ رقم الحدیث ۱۶۶۴۴ (۱۷) فتاویٰ رضویہ ۵/۲۹۹ مطبوعہ سنی دار الاشاعت فیصل آباد (۱۸) تحقیق الحق فی کلمۃ الحق مترجم صفحہ ۱۵۲ مطبوعہ گولڑا شریف ۱۴۱۲ھ (۱۹) حلیۃ الاولیاء ۲/۳۴ طبع بیروت (۲۰) اصلاح المال ابن ابی الدنیا ۱/۴۲۷ رقم ۴۱۰ متوفی ۲۸۱ھ (۲۱) فتح الباری ابن حجر عسقلانی ۶/۸۰ مطبوعہ بیروت (۲۲) المعتصر من المختصر من مشکل الآثار للیوسف الحنفی ۱/۲۸۷ (۲۳) المجموع شرح المہذب ۶/۳۲۷ (۲۴) محض الصواب فی فضائل امیر المومنین عمر بن خطاب ۳/۸۸۹ مطبوعہ مدینہ منورہ (۲۵) الذریۃ الطاہرہ ۱/۲۵۷ رقم ۲۱۲ (۲۶) النہایۃ فی غریب الاثر، ابن اثیر ۲/۵۹۴ مطبوعہ بیروت (۲۷) ثقات ابن حبان ۲/۲۱۶ ذکر خلافت عمر واقعات ۱۷ ہجری (۲۸) تاریخ الاوسط للبخاری ۱/۲/۶۷ رقم ۲۷۹ (۲۹) تاریخ دمشق لابن عساکر ۲۱/۳۴۲ (۳۰) سیرت ابن اسحاق صفحہ ۲۷۵ (۳۱) المستدرک للحاکم ۳/۱۴۲ رقم ۴۶۸۴ (۳۲) سنن نسائی ۱/۸۳۴ رقم ۱۹۸۲ کتاب الجنائز (۳۳) مسند علی بن الجعد ۵۹۳

اہل تشیع کی مستند کتب سے نکاح اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا ثبوت:

شیعہ علما، محققین و مؤرخین نے بھی بڑی شد و مد کے ساتھ زوجہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کے نکاح کا ثبوت لکھا ہے:

(۱) فروع کافی ۵/۱۱۵ کتاب الطلاق میں ہے:

''حمید بن زیاد عن ابی سماعة عن محمد بن زیاد عن عبد اللّٰه بن سنان و معاویة بن عمار عن ابی عبد اللّٰه علیه السلام قال سئلتهٗ عن المرأة المتوفّی عنها زوجها اتعتد فی بیتها او حیث شاء ت قال بل حیث شآء ت ان علیّا علیه السلام لمّا توفی عمر اتیٰ اُم کلثوم فانطلق بها الی بیته۔

(ترجمہ) معاویہ بن عمار نے امام جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ کہتے ہیں کہ میں نے آپ سے اس عورت کے بارے میں پوچھا جس کا شوہر فوت ہو جائے تو کیا وہ اپنے گھر (شوہر کے گھر) عدت گزارے۔ یا جہاں چاہے؟ فرمایا: ہاں؟ جہاں چاہے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو حضرت علی علیہ السلام اُم کلثوم کو اپنے گھر لے آئے۔

اسی کتاب کے اسی صفحہ پر دوسری سند کے ساتھ یہی بات لکھی ہے۔ اس کے تمام راوی شیعہ مذہب کے نزدیک ثقہ ہیں۔ جیسا کہ تنقیح المقال میں ہے:

(۲) قرب الاسناد صفحہ ۱۰۹ مطبوعہ تہران میں ہے:

''اخبرنا عبد اللّٰه اخبرنا محمد حدثنی موسیٰ قال حدثنا ابی عن ابیه عن جده جعفر بن محمد عن ابیه عن جده ان علیّا نقل ابنته ام کلثوم فی عدتها حیث مات زوجها عمر ابن الخطاب

لانها كانت في دار الامارة."

(ترجمہ) جعفر بن محمد اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی سیدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر لے آئے ، جب کہ ان کے خاوند حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ دار الامارت میں اپنی عدت گزار رہی تھیں۔

اس کے تمام راوی بھی ثقہ ہیں جیسا کہ ''تنقیح المقال'' میں ہے۔

(۳) تہذیب الحکام لابی جعفر طوسی ۹/۲۶۲، ۲۶۳ مطبوعہ تہران میں ہے:

''محمد بن احمد بن يحيىٰ عن جعفر بن محمد القمي عن القداح عن جعفر عن ابيه عليه السلام قال ماتت اُم كلثوم بنت علي عليه السلام و ابنها زيد بن عمر بن الخطاب في ساعة واحدة لا يدرىٰ ايهما هلك قبل فلم يورث احدهما من الأخر و صلى عليهما جميعا."

(ترجمہ) قداح نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے انھوں نے اپنے والد گرامی سے بیان کیا کہ سیدہ اُم کلثوم بنت علی علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت زید بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما نے ایک ہی ساعت میں انتقال فرمایا لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان دونوں میں سے پہلے کس کا انتقال ہوا۔ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا وارث نہیں بنا، اور ان دونوں کی نماز جنازہ اکٹھی ادا کی گئی۔

(۴) عمدۃ المطالب صفحہ ۶۳ عقد امیر المؤمنین مطبوعہ نجف اشرف میں ہے:

''اُم كلثوم من فاطمة واسمها رقيه خرجت الى عمر بن خطاب فاولدها زيدا."

(ترجمہ) حضرت اُم کلثوم بنت فاطمہ (جن کا نکاح حضرت عمر سے ہوا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک بیٹا بنام زید پیدا ہوا۔

اسی طرح مختلف الفاظ سے اہل تشیع کی درج ذیل کتب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کا تذکرہ موجود ہے۔

(۱) ناسخ التواریخ ۳/۵۵ طبع تہران (۲) منتہی الامال ۱/۲۱۷ باب دوم فصل ششم در ذکر اولاد حضرت امیر المؤمنین (۳) استبصار کتاب الطلاق باب المتوفی عنہا زوجہا (۴) مجالس المومنین للنور اللہ شوشتری ۱/۲۰۴ مطبوعہ ایران (۵) شرح نہج البلاغہ ابن ابی حدید ۴/۵۷۵، ۵۷۶ مطبوعہ بیروت ۱۳۷۵ھ (۶) طراز المذہب مظفری صفحہ ۳۳ (۷) مسالک الافہام جلد اول کتاب النکاح باب لواحق العقد (۸) کتاب الشافی صفحہ ۱۶ مطبوعہ ایران ۱۳۰۱ھ (۹) منتخب التواریخ صفحہ ۹۵ مطبوعہ تہران (۱۰) اعلام الوریٰ باعلام الھدیٰ صفحہ ۲۰۴ مطبوعہ بیروت (۱۱) تہذیب المتین فی تاریخ امیر المومنین ۱/۲۸۷ مطبوعہ دہلی (۱۲) اصول کافی ۱/۲۸۲ کتاب الحجۃ مطبوعہ تہران (۱۳) صافی شرح اصول کافی للملا خیل قزوینی ۳/۲۸۲ مطبوعہ نولکشور (۱۴) تاریخ یعقوبی ۲/۱۴۹ مطبوعہ بیروت (۱۵) مناقب آل ابی طالب المعروف مناقب شہر آشوب ۳/۳۰۴ (۱۶) الاستبصار ۳/۳۵۲ مطبوعہ تہران (۱۷) انوار النعمانیہ ۱/۱۲۵ (۱۸) کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ صفحہ ۱۰ (۱۹) حدیقۃ الشیعۃ للرد بلی صفحہ ۲۷۶ (۲۰) مستند الشیعۃ ۱۹/۳۳۳ (۲۱) المبسوط للشیخ الطوسی ۴/۲۷۱۔

نکاح حضرت اُم کلثوم کے شبہات اور اس کا ازالہ:

شبـــہ اول: اُم کلثوم جو زوجہ عمر ہیں وہ حضرت علی و حضرت فاطمہ کی اولاد نہیں بلکہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اُم کلثوم جو زوجہ عمر ہیں وہ ۴۹ یا ۵۰ ہجری میں وفات پا گئی تھیں جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی اُم کلثوم واقعہ کربلا میں موجود تھیں۔

جـــواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں اُم کلثوم نام کی دو صاحبزادیاں ہیں۔ ایک اُم کلثوم کبریٰ جن کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا جو حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی سگی بیٹی ہیں اور دوسری اُم کلثوم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری بیوی کی بیٹی ہیں۔ جو اُم کلثوم الصغریٰ کے نام سے مشہور ہیں اور یہ ہی واقعہ کربلا میں موجود تھیں۔ اس کا ثبوت کتب شیعہ سے ملاحظہ فرمائیں:

(۱) الاناث زينب الكبرى وام كلثوم الكبرى وام الحسن و رملة الكبرى ام هاني و ميمونة و زينب الصغرىٰ و اُم كلثوم الصغرىٰ و رقية و فاطمة واحامة و خديجة وام الكرام وام سلمة وام جعفر و جمانة و تقية بنت اخرى لم يذكر اسمها ماتت صغيرة."

(ترجمہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادیاں یہ ہیں: زینب کبریٰ، ام کلثوم کبریٰ، ام الحسن، رملہ کبریٰ ام ہانی، میمونہ، زینب صغریٰ، رملہ صغریٰ، ام کلثوم صغریٰ، رقیہ، فاطمہ، امامہ، خدیجہ، ام الکرام، ام سلمہ، ام جعفر، جمانہ، تقیہ اور ایک صاحبزادی جو بچپن میں فوت ہوگئی تھیں ان کا نام مذکور نہیں۔ (۱- کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ ۱/۴۴۱ ذکر اولاد الذکور والاناث مطبوعہ تبریز، ۲- مناقب آل ابی طالب ۳/۳۰۴ فی از واجہ واولادہ مطبوعہ قم)

مناقب آل ابی طالب میں صاف الفاظ ہیں کہ: ام كـــلثــوم كبــرىٰ تزوجها عمر وام كلثوم صغرىٰ من كثير بن عباس بن عبد المطلب۔

(ترجمہ) یعنی ام کلثوم کبریٰ کا نکاح عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ہوا اور ام کلثوم صغریٰ کا نکاح کثیر بن عباس بن عبد المطلب سے ہوا۔

منتخب التواریخ صفحہ ۹۵ مطبوعہ تہران میں ہے:

''در کتاب حجۃ السعادۃ میفر ماید نقلہ حدیث از طرق معتبرہ نقل نمودہ اند کہ جناب ام کلثوم دختر امیر المومنین وفاطمہ زہرہ والدہ زید بن عمر و رقیہ بنت عمر در حیوۃ حضرت مجتبیٰ۔ در مدینۃ طیبہ از دنیا رحلت۔ ام کلثوم کبریٰ زوجہ عمر بن خطاب بود وھر دو از صدیقہ طاہرہ بودند و زینب صغریٰ وام کلثوم صغریٰ از سائر امہات بوجود آمدند۔

(ترجمہ) کتاب حجۃ السعادۃ میں فرمایا کہ معتبر طریقوں سے حدیث منقول ہے کہ جناب ام کلثوم دختر امیر المومنین وسیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا والدہ زید بن عمر

اور رقیہ بنت عمر نے امام حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی میں مدینہ منورہ میں دنیا سے رحلت فرمائی۔ام کلثوم کبری زوجہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھیں اور دونوں (زینب کبریٰ وام کلثوم کبریٰ) حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرہ کے بطن پاک سے تھیں اور زینب صغریٰ اور ام کلثوم صغریٰ دوسری بیویوں سے تھیں۔

شبہ دوم: حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی کیا تھا مگر یہ ام کلثوم بنت علی وفاطمہ نہ تھیں بلکہ بنت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھیں۔ جو بعد وفات صدیق اکبر پیدا ہوئیں۔ان کی والدہ زوجہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اسما بنت عمیس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں اور یہ ام کلثوم ربیبہ علی ہونے کی وجہ سے بنت علی مشہور ہوگئیں اور مورخین نے غلطی سے ام کلثوم بنت علی لکھ دیا۔

جواب: اس میں پہلا جھوٹ یہ ہے کہ ام کلثوم اسماء بنت عمیس کے بطن سے نہ تھیں بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی ام کلثوم حبیبہ بنت خارجہ بن زید بن ابی زبیر تھیں۔جیسا کہ شیعہ کی کتاب ''ناسخ التواریخ'' میں ہے:''حبیبہ دختر خارجہ در وقت وفات ابوبکر حاملہ بود پس از و دختر پیدا شد و نام ام کلثوم است۔''

(ترجمہ) حبیبہ زوجہ ابوبکر وقت وفات ابوبکر صدیق حاملہ تھیں۔ان کے بعد لڑکی پیدا ہوئی جن کا نام ام کلثوم رکھا گیا تھا۔(ناسخ التواریخ صفحہ ۲۱۵)

اسماء بنت عمیس کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد نکاح کیا۔اور اس وقت محمد بن ابی بکر صرف ساتھ تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت یحییٰ پیدا ہوئے۔جیسا کہ ناسخ التواریخ صفحہ ۷۱۸ میں ہے۔

ام کلثوم بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ بنت حبیبہ کا نکاح طلحہ بن عبداللہ کے ساتھ ہوا نہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔دیکھئے:''ناسخ التواریخ صفحہ ۲۱۷''

ام کلثوم بنت ابی بکر ۱۳ھ کو پیدا ہوئیں اور ۱۷ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا اور ۲۳ھ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔اس وقت ام کلثوم بنت ابی بکر کی عمر صرف دس سال تھی جبکہ ام کلثوم زوجہ حضرت عمر سے دو بچوں کا پیدا ہونا شیعہ کی کتب سے ثابت ہے۔دس سال کی لڑکی سے دو بچوں کا پیدا ہونا یہ کہاں کی عقل ہے،اگر یہ ہوسکتا ہے تو تمام اہل تشیع اور شیعہ نواز لوگوں کو دعوت عام ہے کہ وہ اس کی کوئی مثال پیش کریں۔

شبہ سوم: اگر بالفرض محال یہ مان لیا جائے کہ نکاح تو ام کلثوم بنت علی سے ہوا مگر وہ جبراً وقہراً ہوا نہ کہ رضامندی سے۔

جواب: یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے یہ رشتہ پوری رضامندی کے ساتھ طے کیا تھا۔ملاحظہ فرمائیں:

''**وفی هذا السنة خطب عمر الیٰ علی بن ابی طالب ،ام کلثوم بنت علی،وامها فاطمة بنت رسول الله ،فقال علی:انها صغيرة. فقال: انی لم ارد حيث ذهبت لكنی سمعت رسول الله يقول كل نسب و سبب ينقطع يوم القيامة الا سببی و نسبی وصهری فاردت ان يكون لی سبب و صهر برسول الله فتزوجها وامهرها عشرة الاف دينار.**''

(ترجمہ) اسی سال حضرت عمر فاروق نے حضرت علی سے ام کلثوم بنت علی جن کی ماں فاطمہ بنت رسول اللہ ہیں کا رشتہ طلب کیا۔حضرت علی نے فرمایا: وہ چھوٹی ہیں۔حضرت عمر نے فرمایا کہ میں اُس چیز کا ارادہ نہیں رکھتا جس کا آپ نے خیال فرمایا۔میں تو صرف اس لیے رشتہ طلب کررہا ہوں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ فرمارہے تھے،تمام نسبتیں اور سبب قیامت میں منقطع ہوجائیں گے مگر میرا سبب اور نسب اور صہریت منقطع نہ ہوگی۔پس میں نے ارادہ کیا کہ میرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صہریت (دامادی) کا تعلق پیدا ہوجائے۔اسی پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی ام کلثوم کا ان سے عقد کر دیا۔اور دس ہزار دینار اُن کا حق مہر باندھا۔(تاریخ یعقوبی ۲/ ۱۴۹ مطبوعہ بیروت)

معلوم ہوا کہ یہ نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رضامندی سے ہوا۔

شبہ چھارم: حضرت ام کلثوم سیدہ ہیں اور کوئی غیر سید، سیدہ اولاد رسول کا کفو نہیں اور غیر کفو سے نکاح باطل ہے جیسا کہ فقہ حنفی کا مفتیٰ بہ قول ہے۔

جواب: یہ بھی نکاح ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے انکار کا حیلہ ہے۔چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''ردالمحتار ۳/ ۵۷'' مطبوعہ مصر میں ہے:

''**(قوله بعدم جوازه اصلاً) هذه رواية الحسن عن ابی حنيفة وهذا اذا كان لها ولی لم يرض به قبل العقد فلا يفيد الرضا بعده (بحر) واما اذا لم يكن لها ولی فهو صحيح نافذ مطلقا اتفاقا كما يأتی لأن وجه عدم الصحة علی هذه الرواية دفع الضرء عن الاولياء اما هی فقد رضيت باسقاط حقها(فتح) قوله (وهو المختار للفتویٰ) وقال شمس الائمه وهذا اقرب الی الاحتياط.**''

(ترجمہ) غیر کفو میں اصلاً عدم جواز کا قول یہ امام اعظم سے امام حسن کی روایت ہے اور یہ حکم اس وقت ہوگا جب عورت کا ولی موجود ہو۔اور اس کے نکاح کرنے سے قبل اس کی ناراضگی واضح ہو۔لہٰذا نکاح کے بعد اس کی رضامندی مفید نہ ہوگی اور اگر اس عورت کا ولی ہی موجود نہ ہو تو اس کا نکاح صحیح ہے۔نافذ الطلاق ہوگا۔اور یہ متفق علیہ ہے۔پھر جیسا کہ آگے آئے گا کیونکہ اس روایت کے مطابق نکاح صحیح نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ایسا کرنے سے ولی کو نقصان ہوتا ہے اور اس کا دفع کرنا ضروری ہے لیکن خود عورت کہ جس نے اپنا نکاح غیر کفو میں کردیا تو وہ اپنا حق ساقط کرنے پر راضی ہوگئی۔شمس الائمہ نے کہا کہ مختار للفتویٰ قول میں احتیاط کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ شبہ بھی درست نہیں کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے برضایہ

نکاح کروایا تھا۔ جو کہ ام کلثوم کے ولی ہیں۔علاوہ ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ نکاح غیر کفو والا نہیں جیسا کہ ردالمحتار میں ہے:

''ولهذا زوج علی وهو هاشمی ام کلثوم بنت فاطمة لعمر وهو عدوی...والحاصل انه کمالا یعتبر التفاوت فی قریش حتیٰ ان افضلهم بنی هاشم اکفاء لغیر هم منهم.''

(ترجمہ) اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہاشمی ہونے کے باوجود اپنی صاحبزادی ام کلثوم بنت فاطمۃ الزہرا کا عقد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ حالانکہ وہ عدوی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قریش میں باہم تفاوت غیر معتبر ہے۔ حتیٰ کہ ان سے افضل ہاشمی کا دوسرا کوئی قریشی کفو ہے۔ (ردالمحتار ۳/۸۶،۸۷ باب الکفاءۃ) البدائع والصنائع ۲/۳۱۹ باب الکفاءۃ۔ بحرالرائق ۳/۱۳۰ والکفاءۃ تعتبر نسبا قریش اکفاء)

صحابہ کرام اور اہل بیت کی رشتہ داریاں:

(۱) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بنت ابوبکر زوجہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داماد ابوبکر اور ابوبکر سسر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

(۲) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسماء بنت عمیس جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بھابی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی زوجہ سے ان کی شہادت کے بعد نکاح فرمایا۔ اور یہ اسماء ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہیں۔ اسی طرح حضرت عباس بن عبدالمطلب کی بیوی ام الفضل لبابہ بنت حارث اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیوی سلمیٰ بنت عمیس کی بھی بہن ہیں اور اس طرح یہ سب حضرات آپس میں ہم زلف ہوئے۔

(۳) عبدالرحمٰن بن ابی بکر اپنی زوجہ قریبۃ الصغریٰ جو کہ ام المومنین ام سلمہ بنت امیہ کی بہن ہیں اس لیے یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم زلف ہوئے۔ (طبقات ابن سعد ۸/ ۴۶۸، ۴۶۹ مطبوعہ بیروت)

(۴) امام حسین بن علی رضی اللہ، عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے داماد تھے۔ (طبقات ابن سعد ۸/ ۳۲۴ مطبوعہ بیروت)

(۵) حضرت ام فروہ جو کنیت سے مشہور ہیں۔ بعض نے ان کا فاطمہ اور قریبہ نام بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے والد قاسم بن محمد بن ابی بکر اور ماں اسماء بنت عبدالرحمٰن بن ابی بکر زوجہ امام محمد باقر والدہ امام جعفر صادق رضوان اللہ علیہم ہیں۔ (طبقات ابن سعد ۵/ ۲۳۵، طبقات خلیفہ ابن خیاط صفحہ ۲۶۹) اسی طرح شیعہ حضرات کی کتب ''عمدۃ الطالب صفحہ ۱۹۵، تنقیح المقال صفحہ ۷۳)

(۶) حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت عوام بن خویلد سے ہوئی۔ اور ان سے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

(۷) ام الحسین بنت حسین بن علی بن ابی طالب کا نکاح حضرت عبداللہ بن زبیر بن عوام سے ہوا۔ اس شادی کا تذکرہ شیعہ کتب ''منتہی الآمال ۱/ ۳۴۱، عمدۃ الطالب صفحہ ۲۸۸'' اسی طرح اہل سنت کی کتب ''انساب الاشراف ۲/ ۱۹۳'' اور ''انساب قریش صفحہ ۵۰'' میں ہے۔

(۸) سکینہ بنت حسین بن علی بن ابی طالب کا نکاح مصعب بن زبیر بن عوام سے ہوا۔ (انساب الاشراف ۲/ ۱۹۵، المعارف ابن قتیبہ صفحہ ۳۱۴، سیر أعلام النبلاء، تاریخ بغداد) وغیرہ۔

(۹) ام کلثوم بنت ابراہیم بن محمد بن علی بن ابی طالب کی شادی ابوبکر ابن عثمان بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب سے ہوئی۔ دیکھئے: (نسب قریش صفحہ ۸۷)

(۱۰) حضرت خدیجہ بنت علی بن ابی طالب کی شادی حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز الاموی سے ہوئی۔ دیکھئے: (المحبر صفحہ ۵۷، نسب قریش صفحہ ۶۷ اور شیعہ کی کتاب عمدۃ الطالب صفحہ ۶۰)

(۱۱) رملہ بنت علی کی شادی معاویہ بن مروان بن الحکم سے ہوئی۔ (نسب صفحہ ۴۵، جمہرۃ أالانساب العرب بن حزم صفحہ ۸۷)

(۱۲) حضرت زینب بنت الحسن (المثنیٰ) ابن الحسن بن علی بن ابی طالب کی شادی ولید بن عبدالملک بن مروان سے ہوئی۔ (جمہرۃ الانساب العرب صفحہ ۱۰۸، نسب قریش صفحہ ۵۲)

(۱۳) حضرت ام القاسم بنت الحسن (المثنیٰ) بن الحسن بن علی بن ابی طالب کی شادی مروان بن اُبان بن عثمان بن عفان سے ہوئی۔ (نسب قریش صفحہ ۵۳)

(۱۴) حضرت فاطمہ بنت حسین بن علی بن ابی طالب کی شادی عبداللہ بن عمرو بن عثمان بن عفان سے ہوئی۔ (الاصیلی فی انساب الطالبین صفحہ ۶۵، ۶۶، نسب قریش صفحہ ۵۱، ۵۲) اسی طرح کتب شیعہ، منتھی الآمال ۱/ ۴۹۸، عمدۃ الطالب حاشیہ صفحہ ۹۰)

(۱۴) حضرت اسحاق بن عبد اللہ بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب نے حضرت عائشہ بنت عمر بن عاصم بن عمر بن عثمان بن عفان سے شادی کی۔ (نسب قریش صفحہ ۶۵)

(۱۵) نفیسہ بنت عبید اللہ بن عباس بن علی بن ابی طالب کی شادی عبد اللہ بن خالد بن یزید بن معاویہ بن سفیان بن حرب سے ہوئی۔ اور ان کے بطن سے عباس اور علی پیدا ہوئے۔ (نسب قریش صفحہ ۷۹)

غرض کہاں تک لکھوں طوالت کے خوف سے یہیں پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ میرے سامنے ان رشتہ داریوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک ہی خاندان ہے۔ آپس میں محبت و پیار کرتے تھے ان کو متفرق نہ کیا جائے۔ دونوں کی محبت دل میں ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حق بات واضح ہو جانے کے بعد قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! □□

محمد ثاقب رضا قادری☆

مولانا حسن رضا بریلوی کی تصنیفی خدمات

آخری قسط

(8) دین حسن:

اسلام کی حقانیت پر کتب ہنود و نصاریٰ سے روشن دلائل پر مشتمل یہ رسالہ مولانا حسن رضا کی تصانیف میں ایک نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ راقم کے پیش نظر مطبع اہل سنت و جماعت، بریلی کا نسخہ ہے جس کو مولانا کے صاحبزادے حسنین رضا خان مدیر رسالہ 'الرضا' نے اپنے اہتمام سے طبع کروایا، اس کے کل صفحات 32 ہیں۔ یہ اشاعت مولانا حسن کے وصال کے بعد کی ہے مگر اس پر سن طباعت تحریر نہیں ہے۔ اول طباعت کا سن بھی دستیاب نہیں ہو سکا۔ تاہم ڈاکٹر سید عبداللہ طارق صاحب نے اپنے مقالہ میں اس رسالہ کا اندازاً سن طباعت 1880ء تحریر کیا ہے۔

پاکستان میں ایک عرصہ قبل نوری بک ڈپو نے شائع کیا تھا مگر فی الوقت یہ رسالہ موقوف الاشاعت ہے۔ الحمدللہ راقم اور مولانا محمد افروز قادری چریا کوٹی کی مشترکہ کاوش سے یہ رسالہ جدید ترتیب وعربی و فارسی عبارات کے اردو ترجمہ کے ساتھ انٹرنیٹ پر پبلش ہو چکا اور ان شاء اللہ عنقریب پاکستان میں مکتبۂ اعلیٰ حضرت، لاہور اور انڈیا میں صدر الافاضل اکیڈمی، دہلی سے طبع ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ طارق نے اس رسالہ پر ایک تحقیقی مضمون تحریر کیا، بعض مقامات کی توضیح وتشریح بھی کی ان کا یہ تحقیقی مقالہ ماہنامہ سنی دنیا، بریلی کے 'حسن رضا نمبر' میں چھپ چکا ہے۔ راقم نے اس کی افادیت کے پیش نظر جدید ایڈیشن میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ طارق رسالہ کے بارے تحریر کرتے ہیں:

''دین حسن' مولانا نے عیسائی اور ہندو حضرات کے اعتراضات کا ایک ایسا انتخاب یک جا کر دیا ہے جو ایک طرف مومنین کے لیے باعث تقویت ایمان ہے تو وہیں دوسری جانب ان شاء اللہ مخالفینِ اسلام کے لیے ایک زبردست حجت ثابت ہوگا بشرطیکہ اس رسالے کو ہندی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ کر کے غیر مسلموں تک پہنچانے کی کما حقہٗ کوشش کی جائے۔ مرحوم نے پیغام پہنچا دیا، سننے والوں پر واجب کہ اسے آگے پہنچائیں اور ہدایت قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ غیر مسلم قارئین کی توفیق پر چھوڑ دیں۔''

مولانا محمد افروز قادری تحریر فرماتے ہیں:

''دین حسن' نامی اس کتاب کا چرچا میں نے بھی بارہا سن رکھا تھا۔ مگر کبھی شرفِ مطالعہ اس لیے نصیب نہ ہو سکا کہ کہیں ہاتھ ہی نہ لگی۔ اب جب کہ مدتوں بعد ہاتھ آئی ہے تو جی چاہتا ہے کہ 'یوسف گم گشتہ' کی طرح سینے سے چمٹائے رکھوں، کسی صورت اسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ 'دین حسن' کیا ہے؟ اپنے موضوع پر اسے بالکل اکلوتی کتاب سمجھیں۔ یہ حرف حرف حقیقت تو ہے ہی اپنے اندر قطرہ قطرہ قلزم کی شان بھی رکھتی ہے۔ پڑھیں تو پڑھتے چلے جائیں اور دین کے حسن بے پناہ میں کھو کھو جائیں۔ جس عقلی اور سائنسی نہج پر علامہ حسن رضا بریلوی نے یہ کتاب تالیف فرمائی ہے وہ خاص انہی کا حصہ ہے، اور خانوادۂ رضویت ہی کے کسی سپوت سے اُس کی توقع بھی کی جا سکتی تھی۔ اگر آج ہمارے مصنّفین دعوتِ دین کے لیے 'دین حسن' کا سامان موہنا، اُچھوتا اور دلِ چھوتا اُسلوب اپنالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُن کی باتیں تاثیر کا تیر بن کر لوگوں کے ذہن و فکر میں نہ اُتریں، اور دین کی صحیح قدریں فروغ پذیر نہ ہوں۔'' (مکتوب بنام راقم)

(9) الرائحة العنبریه من المجمرة الحیدریة المعروف به تزک مرتضوی (1300ھ)

ردِ تفضیل پر مولانا حسن رضا کی ایک نادر و نایاب تالیف ہے۔ اس کے دونوں نام تاریخی ہیں ''**الرائحة العنبریه من المجمرة الحیدریة**'' سے سن 1330 ہجری اور 'تزک مرتضوی' سے عیسوی سن 1883ء برآمد ہوتا ہے۔ پہلی بار مطبع جماعت تجارت اسلامیہ، میرٹھ سے طبع ہوئی اور غالبًا دوبارہ شائع نہ ہوئی۔ ایک طویل عرصۂ گمنامی کے بعد سن 2011ء میں مولانا محمد افروز قادری صاحب کی ترتیب وتخریج وتحشیہ کے ساتھ راقم نے پاکستان میں شائع کی۔ جدید اشاعت 48 صفحات پر مشتمل ہے جو کہ مکتبۂ اعلیٰ حضرت، لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس کتاب میں مولانا نے افضلیت شیخین پر کلام فرمایا ہے اور آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ کے ساتھ اکابر علما وصوفیا کے اقوال سے مسلکِ حقہ اہل سنت کی تشریح فرمائی اور فرقۂ تفضیلیہ کو دعوت فکر پیش فرمائی۔ کتاب کے آخر میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی تصنیف ''**مطلع القمرین فی ابانة**

☆ مرکز الاولیاء لاہور، پاکستان

سبقۃ العمرین ''سے 'تبصرۂ سابعۂ' کا کچھ حصہ نقل کیا جس میں مولائے کائنات علی المرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے 18 خصائص کو بیان کیا گیا ہے۔ اشاعت جدید میں راقم نے تبصرۂ سابعہ کی افادیت کے پیش نظر مکمل شامل کر دیا ہے۔ بعض مقامات سے نسخہ کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے مکمل عبارت نقل نہ ہو سکی۔

سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے:

''الحمدللہ کہ درفضائل علیہ جناب مولیٰ علی رضی اللہ عنہ مع بعض دلائل مختصر و عام فہم مسئلہ تفضیل حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایں رسالۂ سیف قاطع و برق لامع مسمّٰی بنام تاریخی 'الرائحۃ العنبریۃ من المجمرۃ الحیدریۃ ''(1300ھ) ملقب بلقب مشعر سال عیسوی اعنی ''تزک مرتضوی''(1883ء) از تالیف لطیف جناب مولوی حسن رضا خان صاحب حسن قادری برکاتی ابوالحسینی بریلوی بفرمائش جناب مولوی غلام شبر صاحب قادری برکاتی ابوالحسینی بدایونی۔''

حیات اعلیٰ حضرت جلد دوم صفحہ 44 پر اس کتاب کو اعلیٰ حضرت کی تصنیف شمار کیا ہے۔ تصانیف اعلیٰ حضرت میں اس کا نمبر شمار 305 درج ہے۔ مزید صفحہ نمبر 148 پر ردنواصب کے عنوان کے تحت اعلیٰ حضرت کی تصنیف کے طور پر بیان کیا ہے۔ مزید صفحہ نمبر 206 پر 'ردتفضیلیہ' کے عنوان سے سات تصانیف کے نام لکھے، جن میں سے ایک ''الرائحۃ العنبریۃ من المجمرۃ الحیدریۃ المعروف بہ تزک مرتضوی'' ہے۔

(10) بے موقع فریاد کے مہذب جواب (1312ھ)

یہ کتاب پنڈت بشن نرائن کی کتاب 'انگریزوں سے ہندوستانیوں کی فریاد' کے رد میں تحریر کی گئی اور 'بے موقع فریاد کے مہذب جواب' کے تاریخی نام سے مطبع نظامی، بریلی سے طبع ہوئی۔ پنڈت بشن نرائن نے اپنی کتاب میں گاؤکشی کے متعلق اسلامی نظریہ پر اعتراضات کیے جس کا تفصیلی جواب اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ سرورق پر مصنف کا نام یوں تحریر ہے 'جناب مولوی نصیرالدین حسن خان صاحب' مولانا حسن رضا کے لیے 'نصیرالدین' کا لقب کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ تاہم مولانا حسن رضا پر مقالات رقم کرنے والے تبصرہ نگاران نے اس کتاب کو مولانا حسن رضا کی تصانیف میں شمار کیا ہے۔ مزید مولانا کے دیوان ''ثمر فصاحت'' کے آخر میں مولانا کی تصانیف کی فہرست دی گئی ہے اس میں اس کتاب کا نمبر شمار 3 ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی مولانا حسن کی تصانیف میں اس کو تیسرے نمبر پر درج کیا اور کچھ آگے جا کر لکھا ''ان میں ابتدائی چھ کتابیں آپ کے زمانۂ حیات میں چھپ کر مقبول خاص و عام ہو چکی تھیں۔'' (ماہنامہ سنی دنیا، حسن رضا نمبر، صفحہ 8 بحوالہ اردوئے معلیٰ)

(11) فتاویٰ القدوہ لکشف دفین الندوہ (1313ھ)

یہ فتوی 1313ھ میں نادری پریس، بریلی سے چھپا۔ سرورق پر ''بسعی وتالیف جناب مولانا مولوی محمد حسن رضا خان صاحب قادری برکاتی ابوالحسینی بریلوی سلمہ اللہ'' تحریر ہے۔ مزید فتوی کا تعارف یوں پیش کیا گیا ہے:

''الحمدللہ! فتوائے مسمّٰی بنام تاریخی ''فتاوی القدوہ لکشف دفین الندوہ'' (1313ھ) جس پر علمائے بمبئی، الہ آباد، دہلی و مرادآباد و رام پور و بدایوں و بریلی و پھپھوند و مارہرہ شریف وغیرہم کے پچاس سے زائد مہر و دستخط ثبت ہیں۔ ان فتاوی کو مولوی لطف اللہ صاحب علی گڑھی نے بھی نہایت حق و صحیح بتایا۔ حواشی میں ندوہ کی کتب رُوداد سے ہر قول کا نشان صفحہ و سطر دے دیا گیا ہے۔ اپنے دینی بھائیوں حضرات اہل سنت سے اسلام و سنت کا واسطہ دے کر معروض کہ خدارا ایک ذرا نظر انصاف سے ملاحظہ ہو۔ ندوہ کے جو اقوال اس کی چھپی ہوئی کتابوں سے نقل کیے ہیں اگر ان میں شک ہو، صفحہ و سطر کا نشان موجود ہے مطابقت فرمالیں اور جب وہ اقوال اس میں موجود ہیں تو ان پر جو احکام علما نے ارشاد فرمائے، ملاحظہ ہو جائیں۔ جن سے آفتاب کی طرح روشن کہ کتب ندوہ میں مذہب اہل سنت سے کس قدر مخالفتیں واقع ہوئیں۔ للہ! انصاف اگر ہم فقرا محض بنظر خیر خواہی ندوہ ان خرابیوں سے اسے پاک کرنے اور سچا ندوہ علمائے اہل سنت بنانے کی درخواست کرتے ہیں کیا گناہ کرتے ہیں!!! ندوہ کو اگر یہ فتاوائے علما مقبول نہیں، پہلے انہیں سوالوں کا خود منصفانہ جواب مطابق مذہب اہل سنت عنایت کرے۔ کتب ندوہ میں اس قسم کی خرابیاں بکثرت ہیں یہ سوالات صرف بطور نمونہ ہیں۔ اگر ندوہ نے ان سے عہدہ برائی کر لی اور سوال حاضر کیے جائیں گے یہاں تک کہ یا ہم سمجھ لیں یا ندوہ کو خدا پاک کر دے۔''

حیات اعلیٰ حضرت جلد دوم ص 23 اور 202 پر اس کتاب کو اعلیٰ حضرت کی تصنیف شمار کیا ہے۔ ''المجمل المعد دلتالیفات المجدد'' میں اس کا نمبر شمار 127 درج ہے۔

(12) آئینہ قیامت:

واقعاتِ کرب و بلا کے دل کش اور نہایت موثر بیان پر مشتمل، دلائل و براہین سے مزین تصنیف ہے۔ پاک و ہند میں اب تک اس کے کئی ایڈیشنز

چھپ چکے اور قبولیت عامہ پا چکے ہیں۔ حال ہی میں دعوت اسلامی کے ادارہ المدینۃ العلمیہ نے اس رسالہ کو جدید ترتیب وتخریج کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس سے قبل مکتبہ رضویہ، لاہور کے مؤسس جناب ظہور الدین امرتسری نے الیکٹرک پریس، بریلی کے مطبوعہ نسخہ کو مجاہد ملت جناب مولانا عبدالستار نیازی علیہ الرحمۃ کی ترتیب وتحشیہ سے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ مولانا عبدالستار نیازی نے 'پیغام حیات' کے عنوان سے 92 صفحات پر مشتمل نہایت مبسوط اور جامع مقدمہ تحریر کیا جو کہ اصل کتاب کے سائز سے بڑھ کر ایک الگ کتاب کی حیثیت اختیار کر گیا۔ راقم کے پیش نظر الیکٹرک پریس بریلی کا بارنہم (56 صفحات) اور حسنی پریس، بریلی بارششم (48 صفحات) کے ایڈیشن ہیں۔ مؤخر الذکر رسالہ مولانا حسنین رضا خان کی تصحیح واہتمام سے طبع ہوا۔

آئینہ قیامت کے علمی وتحقیقی معیار کی توثیق خود امام اہل سنت نے فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی صاحب نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے عرض کیا کہ محرم کی مجالس میں جو مرثیہ خوانی ہوتی ہے سننا چاہیے یا نہیں؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ''مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کی کتاب جو عربی میں ہے وہ یا حسن میاں مرحوم میرے بھائی کی کتاب 'آئینۂ قیامت' میں صحیح روایات ہیں، انہیں سننا چاہیے۔'' (الملفوظ حصہ دوم:100)

مفتی اعظم ہند مصطفیٰ رضا خان نوری علیہ الرحمۃ اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں: ''آئینۂ قیامت تصنیف حضرت عمی جناب استاد زمن حسن رضا خان حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، یہ کتاب اعلیٰ حضرت کی دیکھی اور مجالس میں کتنی ہی بار سنی ہوئی ہے۔ (فتاوی مصطفویہ:463 مطبوعہ شبیر برادرز، لاہور)

آئینۂ قیامت کے سرقہ کی پُراسرار داستان:

ماہنامہ دین ودنیا، دہلی کے ایڈیٹر مفتی شوکت علی فہمی نے 'آئینۂ قیامت' میں تحریف وترمیم کی اور کچھ اپنی طرف سے مضامین کا اضافہ کر کے 'داستانِ کربلا' کے نام سے شائع کیا۔ اس جدید اشاعت میں اس نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات بابرکات پر کیچڑ اچھالنے کی مذموم سعی کی جو کہ مسلک اہل سنت کے سراسر منافی ہے۔ ماہنامہ دین ودنیا، دہلی میں 'داستانِ کربلا' کا اشتہار پا کر علامہ سبطین رضا خان نے اس کا مطالعہ کیا اور اس مذموم سازش کو بے نقاب کرتے ہوئے ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا جو کہ ماہنامہ اعلیٰ حضرت، ستمبر اکتوبر 1975ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں یہی مضمون مولانا جنید رضا خان کے توضیحی نوٹ کے ساتھ ماہنامہ سُنی دنیا، بریلی کے حسن رضا نمبر 1994ء میں شائع ہوا۔

اس کے علاوہ بھی آئینۂ قیامت میں کچھ ترمیم واضافہ ناشرین کی کرم فرمائی سے ہوتا رہا۔ چنانچہ مدیر سنی دنیا شہاب الدین رضوی صاحب لکھتے ہیں:

''راقم السطور نے جب قدیم اور جدید نسخہ کا تقابل کیا تو یہ بات بالکل صاف ہوگئی کہ مولانا حسن رضا قدس سرہ کی تصنیف 'آئینۂ قیامت' میں کچھ اشعار کسی شاعر کے شامل کر دیے گئے ہیں یہ حرکت ناشر کی طرف سے ہوئی، پہلی بار کتاب جماعت رضائے مصطفیٰ کے زیر اہتمام حسنی پریس، بریلی سے مولانا حسنین رضا خان بریلوی کی تصحیح سے شائع ہوئی۔ دوبارہ بریلی کے مشہور میلاد خواں صوفی عزیز صاحب نے شائع کی، تیسری بار قومی کتب خانہ، بریلی نے شائع کی۔ پہلا اور تیسرا ایڈیشن راقم السطور کے پیش نظر ہے تیسرے ایڈیشن میں کسی دوسرے کے اشعار سامنے آئے جس سے بڑی حیرت ہوئی، فوراً ہی جا کر مینیجر قومی کتب خانہ بڑا بازار سے دریافت کیا تو انہوں نے دوسرا ایڈیشن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں ایسی بات ہے اس لیے ہم نے کوئی کمی بیشی نہیں کی ہے صرف اس کا عکس کرا لیا ہے۔ تیسرے ایڈیشن میں سرورق پر مصنف کی طرف سے ایک نوٹ بھی لگا ہوا ہے جبکہ یہ نوٹ پہلے ایڈیشن میں نہیں ہے۔'' (ماہنامہ سنی دنیا: مولانا حسن رضا نمبر، صفحہ 158-159)

(13) ہدایت نوری بجواب اطلاع ضروری:

مولانا حسن رضا کی تصانیف میں کسی بھی تذکرہ نگار نے اس کو شمار نہیں کیا، یہ راقم کی طرف سے اضافہ ہے۔ تاہم کچھ محققین نے 'قہر الدیان علی مرتد بقادیان' کو مولانا حسن رضا کی تصنیف میں ذکر کیا ہے اور بعض محققین نے اسے اعلیٰ حضرت محدث بریلوی کی تحریر شمار کیا ہے جیسا کہ حیات اعلیٰ حضرت جلد دوم صفحہ 34 پر ہے۔ تصانیف اعلیٰ حضرت میں اس کا نمبر شمار 224 درج ہے۔ اس کے علاوہ صفحہ 142 پر رد قادیانیت میں تصانیف اعلیٰ حضرت کی فہرست میں بھی اس کا نام درج ہے۔ پھر فتاوی رضویہ مخرجہ کی جلد 15 میں یہ رسالہ شامل ہے۔ ادارہ تحفظ عقائد اسلامیہ، کراچی کی طرف سے شائع کردہ ''عقیدۂ ختم نبوت'' کی جلد ثانی میں بھی یہ رسالہ اعلیٰ حضرت کی تصنیف کے طور پر شامل ہے۔

قہر الدیّان علی مرتدٍ بقادیان کس کی تصنیف ہے ؟

اس ضمن میں عرض ہے کہ 'قہر الدیان علی مرتد بقادیان' کو اعلیٰ حضرت یا مولانا حسن رضا کی تصنیف قرار دینا درست نہیں۔ کیونکہ یہ کسی تصنیف کا نام نہیں بلکہ رد قادیانیت میں مولانا حسن رضا خان کی طرف سے جاری کردہ

ماہنامہ ہے۔ چونکہ رسالہ 1323ھ میں جاری ہوا، اس لیے مولانا حسن رضا نے اسی مناسبت سے ایک تاریخی نام کا انتخاب فرمایا۔ راقم کے پاس اس رسالہ کا عکس موجود ہے جو کہ خانوادۂ قادریہ، بدایوں سے مولانا اُسید الحق قادری نے عنایت کیا۔ اس کے علاوہ اس رسالہ کا ایک نسخہ محکمہ آثار قدیمہ، کراچی کے میوزیم میں بھی موجود ہے۔ اس کے آخری صفحہ پر مولانا حسن رضا کی طرف سے جاری کردہ 10 نکات پر مشتمل اشتہار ہے جس میں اس ماہنامہ کی شرائط وضوابط تحریر ہیں ان میں سے پہلی یہ ہے "یہ رسالہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہر قمری مہینہ میں ایک بار شائع ہوگا" کچھ دیگر شرائط متعلقہ رکنیت سازی، زر معاونت کی بابت تحریر ہیں اور نمبر 5 پر مولانا حسن رضا اس رسالہ کے اجرا کا مقصد تحریر فرماتے ہیں:

"اس رسالہ کا مقصد صرف مرزا و مرزائیان کا رد اور ان کے ان ناجائز حملوں کا دفع ہوگا جو انہوں نے عقائد اسلام و انبیائے کرام خصوصًا سیدنا عیسیٰ وحضرت مریم وخود حضور سید الانام علیہ وعلیہم الصلاۃ والسلام حتی کہ رب العزت ذوالجلال والاکرام پر کیے ہیں، دوسرے فرقوں کا رد اس کا موضوع نہیں۔ اس کے لیے بعونہ تعالیٰ مبارک رسالہ تحفۂ حنفیہ عظیم آباد نیز اہل سنت کی اور کتب کافی ووافی ہیں۔"

مزید یہ کہ اس رسالہ کے سرورق پر رسالہ کے نام کے ساتھ دائیں بائیں دوبار 'ماہوار' تحریر ہے۔ مزید سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے:

"الحمد للہ! مبارک ماہواری رسالہ محمد رسول اللہ خاتم النّبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف پر قہر الٰہی ڈھانے والا، عیسیٰ مسیح کلمۃ اللہ کے دشمن پر تیغ عذاب چمکانے والا، جھوٹے مسیح مرزا قادیانی اور اس کے الہام ووحی شیطانی کی بنیاد گرانے والا، محمدی فتح کے پھریرے اڑاتا، اسلامی شان کے نشان چمکاتا۔"

مزید تحریر ہے: "زیر ادارت ماحی بدعت حامی سنت مولانا مولوی محمد حسن رضا خان سنی حنفی قادری برکاتی بریلوی سلّمہٗ۔"

اندرون صفحہ پر رسالہ کے اجرا میں معاونت کرنے والے حضرات کے اسمائے گرامی کی فہرست ہے جن کی تعداد تقریباً 85 ہے۔

عربی خطبہ کے بعد مولانا حسن رضا کا اداریہ ہے جس کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"یہ ایک غیبی تحریک ہوگئی جس نے اس ارادۂ رسالہ کی سلسلہ جنبانی فرمادی۔ اشتہار کا جواب اشتہاروں میں دیا گیا۔ مناظرہ کے لیے ابکار افکار مرزا قادیانی کو پیام دیا۔ اس کے ہولناک اقوال ادعائے رسالت ونبوت و افضلیت من الانبیاء وغیرہا کفر وضلال کا خاکہ اڑایا۔ گالیوں کے جواب میں گالی سے قطعی احتراز کیا صرف اتنا دکھایا کہ تمہاری گالی آج کی نرالی نہیں۔ قادیانی تو ہمیشہ سے اللہ ورسول وانبیائے سابقین وائمہ دین سب کو گالیاں سنتا رہا ہے۔ ہر عبارت اس کی کتابوں سے بحوالۂ صفحہ مذکور ہوئی۔ مضمون کثیر تھا متعدد پرچوں میں اشاعت منظور ہوئی۔ 'ہدایت نوری بجواب اطلاع ضروری' نام رکھا گیا۔ اس میں دعوتِ مناظرہ، شرائطِ مناظرہ، طریقِ مناظرہ، مبادی مناظرہ سب کچھ موجود ہے۔ اس مختصر تحریر نے اپنی سلک منیر میں متعدد سلاسل لیے سلسلۂ دشنامہائے قادیانی بر حضرت ربانی ورسولان رحمانی ومحبوبان یزدانی، سلسلۂ کفریات وضلالات قادیانی، سلسلۂ تناقضات و تہافتات قادیانی، سلسلۂ دجالی وتلبیسات قادیانی، سلسلۂ جہالات و بطالات قادیانی، سلسلۂ تاصیلات سلسلۂ سوالات اور واقعی وقتی ضرورات مختلف مضامین پر کلام کی مقتضی ہوتی ہیں اور اس کے اکثر رسائل الٹ پھیر کر انہیں ڈھاک کے تین پات کے حامل۔ لہٰذا ہر رسالے کے جداگانہ رد سے انہیں سلاسل کا انتظام احسن واولیٰ۔

اب بعونہ تعالیٰ اسی 'ہدایت نوری' سے ابتدائے رسالہ ہے اور مولیٰ تعالیٰ مدد فرمانے والا ہے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً رسائل ومضامین میں حسب حاجت اندراج گزیں مناسب کہ جو کلام جس سلسلے کے متعلق آتا جائے بہ شمار سلسلہ اسی کی سلک میں انسلاک پائے جو نیا کلام ان سلاسل سے جدا شروع ہو، اس کے لیے تازہ سلسلہ موضوع ہو۔ اعتراضات کے تازیانے جن کا شمار خدا جانے اول تا آخر ایک سلسلے میں منضود اور ہر اعتراض حاشیہ پر تازیانہ یا اس کی علامت 'ت' لکھ کر جدا معدود۔ مسلمانوں سے تو بفضلہٖ تعالیٰ یقینی امید مدد وموافقت ہے، مرزائی بھی اگر تعصب چھوڑ کر خوف خدا اور روز جزا سامنے رکھ کر دیکھیں تو بعونہ تعالیٰ امید ہدایت ہے۔"

اس قدر طویل اقتباس نقل کرنے کا مقصد 'قہر الدیان علی مرتد بقادیان' کی حیثیت واقعی کو واضح کرنا تھا۔ مولانا حسن رضا کے اس اداریہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "ہدایت نوری بجواب اطلاع ضروری" مولانا حسن رضا کی تصنیف ہے جو کہ اس رسالہ میں قسط وار شائع ہوئی۔ ابھی تک اس رسالہ کا صرف پہلا شمارہ ہی دستیاب ہو سکا ہے۔ پہلی قسط کے اختتام پر آئندہ آنے والی قسط کی بابت یوں تحریر ہے: "فصل دوم: علی مرتضیٰ وامام حسن وامام حسین وفاطمہ زہرا اور خود محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیہم وسلم پر

قادیانی کی گالیاں۔۔باقی آئندہ''

(14) ندوہ کا تیجہ رُوداد سوم کا نتیجہ (1314ھ)

یہ کتاب مشتملہ 61 صفحات مطبع اہل سنت و جماعت ، بریلی سے 1314ھ میں طبع ہوئی۔سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے:

''الحمدللہ! یہ مبارک رسالہ جس میں بہت روشن ودل پسند وعام فہم وسود مند بیان سے ظاہر کیا ہے کہ ندوہ کا اصل مقصد کیا ہے اوراس دعوت اتحاد و اتفاق کی کس خیال پر بنا ہے،اس ندوہ اخیر کوندوہ سابقہ دارالندوہ سے علاقہ کتنا ہے۔آخر میں ندوہ کی مختصر رُوداد سوم کی نامہذب دشناموں، باطل اتہاموں کے معقول جواب مظہر صواب (تحریر ہیں۔)''

سرورق پر مولانا حسن رضا کا نام یوں تحریر ہے:''مداحِ مصطفیٰ،خادم الاولیا، صاحب طبع نقاد وذہن وقاد جناب مولانا مولوی محمد حسن رضا خان صاحب حسنؔ قادری برکاتی ابُوالحسینی سلمھم اللہ عن الافات والمحن''

حیات اعلیٰ حضرت جلد دوم صفحہ 45 اورص 202 پر اس کتاب کو اعلیٰ حضرت کی تصنیف شمار کیا ہے۔تصانیف اعلیٰ حضرت میں اس کا نمبر شمار 318 درج ہے۔

(15) اظہار رُوداد (1322ھ)

دارالعلوم 'منظر الاسلام' کی پہلے سال کی رُوداد ہے جو کہ مولانا حسن رضا کی ترتیب سے 1322ھ میں مطبع اہل سنت ،بریلی سے شائع ہوئی۔اس رُوداد میں مدرسہ کے ساتھ تعاون کرنے والے مخیرّ حضرات کے اسمائے گرامی درج ہیں اور مدرسہ سے جاری ہونے والے آٹھ عدد فتاوی شامل ہیں۔اس رسالہ کا مکمل عکس ماہنامہ اعلیٰ حضرت، بریلی کے''صد سالہ فتاوی منظرالاسلام نمبر''(تیسری قسط) میں موجود ہے۔

(16) کوائف اخراجات (1323ھ)

یہ'منظرالاسلام' کے دوسرے سال کی رُوداد ہے، اس میں دوسرے سال کی آمدنی اور خرچ کی تفصیلات ہیں۔نیز کلاس وار طلبہ کی تعداد اور زیر درس کتابوں کی نشاندہی،اساتذہ و ممتحن حضرات کے اسمائے گرامی بھی درج ہیں۔علامہ عبدالحکیم شرف قادری علیہ الرحمۃ اس رُوداد پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس روئداد سے منظرالاسلام کے نصاب کا پتہ چلتا ہے،نصاب میں جہاں منطق کی کتب میرزاہد، ملاجلال، ملاحسن، حمداللہ، قاضی مبارک، شرح سلم، بحرالعلوم، فلسفہ میں میبذی اور علم ہیات میں تصریح وغیرہ کتب شامل ہیں،شفا شریف اور مسند امام اعظم بھی شامل نصاب ہیں جنہیں آج بھی شامل نصاب کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح فارسی کی متعدد کتب تعلیم عزیزی،اخلاق محسنی،انوار سہیلی،گلزار دبستاں (حصہ اول)، رُقعات، مظہرالحق وغیرہ شامل ہیں۔''(ماہنامہ اعلیٰ حضرت، منظرالاسلام نمبر۔قسط دوم 56)

روئداد کے صفحہ نمبر 51 پر مولانا شاہ سلامت اللہ رام پوری منتظم مدرسہ مولانا حسن رضا کی بابت تحریر فرماتے ہیں:

''ہمت عالی اور توجہ خاص منتظم دفتر جناب مولانا حسن رضا خان صاحب دام مجدہم سے اُمید کامل ہے کہ اس مدرسہ مبارکہ سے جس کی نظیر اقلیم ہند میں کہیں نہیں ہے،ایسے برکات فائض ہوں جو تمام اطراف وجوانب کی ظلمات اور کدورات کو مٹائیں اور ترویج عقائد حقہ مُنیفہ اور ملت بیضا شریفہ حنیفہ کے لیے ایسی مشعلیں روشن ہوں جن سے تمام عالم منور ہو۔''

اس رُوداد کے کل 52 صفحات ہیں،مولانا حسن رضا کی ترتیب سے مطبع اہل سنت وجماعت، بریلی سے طبع ہوئی۔

(17) سوالات حقائق نما بر رؤس ندوۃ العلماء (1313ھ)

سوالات حقائق نما بر رؤس ندوۃ العلما 19 رمضان المبارک 1313ھ میں نادری پریس، بریلی سے مولانا حسن رضا کی تقدیم کے ساتھ طبع ہوئی۔سرورق پر مؤلف کا نام بھی''حسن رضا خان قادری برکاتی بریلوی غفرلہٗ'' تحریر ہے۔مزید سرورق پر کتاب کا تعارف تحریر ہے:

''اس میں 70 سوالات ہیں کہ محض بنظر خیر خواہی ندوہ وحفظ مذہب اہل سنت حضرت ماحی فتن حامی سنن خادم شرع وملت عالم اہل سنت جناب مولانا مولوی احمد رضا خان صاحب محمدی سُنی حنفی قادری برکاتی دامت فیوضہم نے خود ندوہ کی خواہش ودرخواست پر پیش فرمائے اور باوصف بار بار کثیر تقاضوں کے لاجواب رہے۔ان سوالات سے ہر سُنی کو واضح ہوگا کہ سوئے اتفاق سے ندوہ کی کارروائیوں تحریروں تقریروں میں کتنی باتیں مضر ومخالف مذہب اہل سنت واقع ہوئیں،جن کی اصلاح اور مذہب حق کی پابندی ندوۃ العلما کا پہلا فرض ہے۔بنظر خیر خواہی مکرراً معروض کہ ندوہ یا تو سچے انصاف سے عالمانہ جواب دے ورنہ سچی پابندی مذہب اہل سنت اختیار کرے۔ وباللہ التوفیق''

اس مکتوب کو ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی نے مولانا حسن رضا کی تقدیم کو حذف کرتے ہوئے مکاتیب رضا کی جلد دوم صفحہ نمبر 107، 127 پر نقل کیا ہے۔□□

خصوصی موضوع

اس نازک ترین دورِ پرفتن میں حق پرست اور راست رو سچّے اہلِ ایمان لوگوں پر طرح طرح کی اتہام تراشیاں کر کے ان کو بدنام کرنے کی ناکام کوششیں کی جارہی ہیں تاکہ سادہ دل لوگوں کا اعتماد ان حق پرستوں پر نہ رہے اور جب حق پرستوں پر اعتماد ختم ہوجائے گا، حق پرستی کا ذوق بھی مفقود ہوجائے گا تو پھر گمراہی کے زہریلے اثرات امتِ مسلمہ کے اندر آسانی کے ساتھ پیوست کیے جاسکیں گے۔ اس مذموم پروگرام کی ایک شاخ یہ بھی ہے کہ جب بھی کبھی تقاضائے وقت کے تحت کسی نیک کام کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو اس نیک کام کو بدعت سے موسوم کر کے عاملین کو اس پر عمل کرنے سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے اس مذموم پروگرام سے پردہ کشائی لازم تھی تاکہ حق پرست لوگ قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ مسئلہ سمجھ سکیں کہ کسی نیک کام کی ابتدا کرنا بدعتِ سیئہ نہیں ہے بلکہ صالحین کی سنت ہے اور اجر جزیل کا سبب ہے۔ زیر نظر مضمون میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ بدعت کی کتنی اقسام ہیں؟ اور پھر کیا تمام بدعات عنداللہ مذموم ہیں یا یہ کہ بعض بدعات مقبول بھی ہیں۔ اس نتیجہ پر بآسانی پہنچ سکیں گے کہ ہر بدعت بری نہیں بلکہ بعض بدعات حسنہ بھی ہیں جن پر عمل پیرا ہونا اجر وثواب کا سبب ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث سے جس مسئلہ کا فیصلہ مل جائے اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ اس پر اعتقاد رکھے اور عمل بھی کرے اور شبہات وشکوک کو بالکل ختم کردے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ زیر نظر علمی وتحقیقی مقالہ ایک مختصر کتابچے کی صورت میں ''ارشاد العاملین فی بدعتِ الصالحین'' کے نام سے محترم فیض محمد شاہ جمالی ناظم جامعہ فریدیہ فیض الاسلام، ڈیرہ غازی خاں، پنجاب (پاکستان) نے اپنے مذکورہ ادارہ کے شعبۂ نشر واشاعت کی جانب سے کئی سال قبل شائع کیا تھا۔ اب افادۂ قارئینِ 'ماہِ نور' کے لیے اسے شائع کیا جارہا ہے۔ قارئین اپنی قیمتی رائے سے ادارے کو سرفراز فرمائیں۔ (نوشاد عالم چشتی)

بدعتِ حسنہ: قرآن وسنت اور اقوالِ ائمہ کی روشنی میں

مولانا محمد فیض شاہ جمالی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ بَدِیْعِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَ رِضْوَانُ اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ سَلَکُوْا طَرِیْقَ الصَّالِحِیْنَ. وَابْتَدَعُوْا بِدْعَۃً حَسَنَۃً لِلسَّالِکِیْن وَاسْتَحقو بھا الْاَجْرَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ. اَمَّا بَعْد

فقیر اس مختصر مضمون میں قرآن و حدیث پاک کے حوالہ جات اہلِ ایمان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہے، جس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوجاتی ہے کہ ہر بدعت بری اور مذموم نہیں ہے، بلکہ بعض بدعات ایسی بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر ایجاد کی جاتی ہیں اور ان امور کے ایجاد اور ابتدا کرنے والے حضرات اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثواب کے مستحق ہوتے ہیں، اور نیز ضابطۂ شریعت کے مطابق ایسی نیک بدعت کو ترک کرنے والے گنہگار وفاسق کہلاتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ رَھْبَانِیَّۃِ ابْتَدَعُوْھَا مَاکَتَبْنَاھَا عَلَیْھِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ فَمَارَعَوْھَا حَقَّ رِعَایِتِھَا فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْھُمْ اَجْرَھُمْ وَ کَثِیْرٌ مِّنْھُمْ فَاسِقُوْنَ. (القرآن الکریم، پارہ ۲۷)

یعنی انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کرلیا، ہم نے ان پر واجب نہ کیا تھا لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس بدعت کو اختیار کیا تھا۔ پس انھوں نے اس رہبانیت ایجاد شدہ کی پوری رعایت نہ کی۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اس رہبانیت مبتدعہ پر قائم رہے ہم نے ان کو اجر دیا اور زیادہ ان میں بے فرمان ہیں جنھوں نے اس بدعتِ رہبانیت کو چھوڑ دیا۔

اس آیتِ کریمہ سے صحیح مقصد سمجھنے کے لیے پانچ مطالب کا سمجھنا پہلے ضروری ہے۔

مطلب اوّل:

اس بدعت کی ابتدا اور ایجاد صالحینِ امت نے کی تھی یا کہ فاسقین نے تاکہ ہم اس معنی کو سمجھ سکیں کہ نیک کام کی ابتدا کرنا کن لوگوں کی سنت ہے۔ اب اس آیتِ کریمہ کے ترجمہ میں معتبر مفسرین کی تفاسیر سے حوالہ جات پیش کر کے وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بدعت کی ایجاد اور ابتدا صالحینِ امت نے ہی فرمائی تھی۔

اس آیت کی تفسیر میں صاحبِ تفسیر مظہری ارشاد فرماتے ہیں:

۱. وَ رَھْبَانِیَّۃِ ابْتَدَعُوْھَا اَیْ اِبْتَدَعَھَا ھٰؤلآءِ الصَّالِحُوْنَ یعنی رہبانیت کی بدعت صالحین امت نے ایجاد فرمائی تھی۔ (ج۹،ص۲۰۳-۲۰۴)

۲. تفسیر خازن، ج ۷، ص۳۴ پر ہے کہ اس بدعت کی ایجاد صالحینِ اُمت نے فرمائی تھی۔

۳. معالم التنزیل ج ۴، ص ۱۳۴ پر ہے کہ اس بدعت کی ایجاد صالحینِ امت نے فرمائی تھیں۔

۴. تفسیر قرطبی ج ۱۷، ص ۲۶۴ پر ہے کہ اس بدعت کی ایجاد صالحینِ اُمت نے فرمائی تھی۔

۵. تفسیر جمل ج ۴، ص ۲۹۶ پر ہے کہ اس بدعت کی ایجاد صالحینِ امت نے فرمائی تھی۔

۶. تفسیر صادی ج ۴، ص ۱۵۰ پر ہے کہ اس بدعت کی ایجاد صالحینِ امت نے فرمائی تھی۔

۷. تفسیر کبیر ج ۱۵، ص ۲۴۷ پر ہے کہ اس بدعت کی ایجاد صالحینِ امت نے فرمائی تھی۔

اختصارِ مضمون کے پیشِ نظر مذکورہ بالا سات تفسیروں کے حوالہ سے اس آیتِ کریمہ کا مقصد واضح کردیا کہ نیک کام کی بدعت کا ایجاد صالحینِ اُمت نے کیا تھا۔ پھر صالحین کا کام صالح اور نیک ہوا کرتا ہے۔ اس بدعت کی ایجاد کے بعد بھی وہ صالح رہے۔ اپنے نیک اعمال کی وجہ سے ہی ان کا صالحین میں شمار ہے۔

۱. نیک لوگوں کا عمل نیک ہوا کرتا ہے۔ اس کی اقتدا بھی نیک ہوا کرتی ہے۔

۲. نیک لوگوں کی اتباع اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کا سبب ہوا کرتا ہے: وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ. (القرآن) یعنی نیک لوگوں کی نیکی پہ اتباع کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ راضی ہے۔

۳. نیک لوگوں کی راہ پر چلنا ان کی پیروی کرنا، امر الٰہی ہے: وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (القرآن) یعنی جن کا رجوع میری طرف ہو ان کی تابعداری کرو۔

۴. نیک لوگوں کی راہ پر چلنا صراطِ مستقیم ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (القرآن) یعنی اے اللہ! صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما۔ یہ صراطِ مستقیم انعام یافتہ انبیا، صدیقین، شہدا، صالحین کا راستہ ہے۔ ان کی راہ چلنے والا صراطِ مستقیم پر ہے۔

جب نیک بدعت کی ایجاد اور پھر اس پر عمل کرنا صالحینِ امت کا راستہ ہے تو پھر نیک بدعت کی ایجاد اور اس پر عمل کرنا بھی نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب بھی اور امر الٰہی کی اتباع بھی ہے اور صراطِ مستقیم بھی۔

اهل علم کے حضور:

علم منطق باب القیاس اشکالِ اربعہ سے معتبر اور بدیہہ الانتاج شکل اوّل کے اعتبار سے توجہ مطلوب ہے:

صغریٰ	کبریٰ	نتیجه
(۱) بَعْضُ الْبِدْعَاتِ ابْتَدَعَهَا الصَّالِحُوْنَ ترجمہ: بعض بدعات صالحین نے ایجاد فرمائیں۔	كُلُّ مَا ابْتَدَعَهُ الصَّالِحُوْنَ فَهُوَ حَسَنٌ ترجمہ: اور ہر وہ بدعت جس کو صالحین نے ایجاد فرمایا وہ حسن ہے	فَبَعْضُ الْبِدْعَاتِ حَسَنٌ. پس بعض بدعات حسن ہیں۔
(۲) بَعْضُ الْبِدْعَاتِ عَمَلَ بِهِ الصَّالِحُوْنَ ترجمہ: بعض بدعات پر صالحین عمل پیرا ہوئے۔	كُلُّ مَا عَمِلَ بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَهُوَ مُوْجِبُ رِضْوَانِ اللّٰهِ ترجمہ: اور جس پر صالحین عمل پیرا ہوں وہ عمل اللہ کی خوشنودی کا سبب ہوتا ہے۔	فَبَعْضُ الْبِدْعَاتِ مُوْجِبُ رِضْوَانِ اللّٰه ترجمہ: پس بعض بدعات اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہوتی ہیں۔
(۳) بَعْضُ الْبِدْعَاتِ عَمِلَ بِهِ الصَّالِحُوْنَ ترجمہ: بعض بدعات پر صالحین عمل پیرا ہوئے۔	كُلُّ مَا عَمِلَ بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَالْعَبْدُ مَاْمُوْرٌ بِاِتِّبَاعِهٖ. ترجمہ: اور جس پر صالحین عمل پیرا ہوں نیک بندے اس پر اتباع کے مامور ہیں۔	فَبَعْضُ الْبِدْعَاتِ الْعَبْدُ مَاْمُوْرٌ بِاِتِّبَاعِهٖ ترجمہ: پس بعض بدعات پر نیک بندے مامور بالاتباع ہیں۔
(۴) بَعْضُ الْبِدْعَاةِ عَمِلَ بِهِ الصَّالِحُوْنَ ترجمہ: بعض بدعات پر صالحین عمل پیرا ہوئے۔	وَكُلُّ مَا عَمِلَ بِهِ الصَّالِحُوْنَ هُوَ صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ. ترجمہ: اور جس پر صالحین عمل پیرا ہوں وہ صراطِ مستقیم ہے	فَبَعْضُ الْبِدْعَاةِ هُوَ صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ. ترجمہ: پس بعض بدعات پر عمل صراطِ مستقیم ہے۔

مطلب دوم:

امتِ مسلمہ کے صالحین پاکباز لوگوں نے اس بدعت کی بنیاد اور ایجاد کس غرض سے فرمائی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں ہی ان صالحین کی غرض کا ذکر فرمایا: اِبْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ یعنی ان صالحین لوگوں نے اس نیک بدعت رہبانیت کی ایجاد فقط اس غرض سے کی تھی تاکہ اللہ تعالیٰ اس نیک بدعت کی وجہ سے راضی اور خوش ہو جائے اور اس پر ہم اجر وثواب کے حقدار بن جائیں۔

صاحبِ تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں: اَىْ مَا قَضَيْنَاهَا عَلَيْهِمْ بِاَنْ جَعَلْنَاهُمْ يَبْتَدِعُوْنَهَا بِشَيْئٍ مِنَ الْاَشْيَاءِ اِلَّا يَبْتَغُوْا بِهَا رِضْوَانَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ يَسْتَحِقُّوْا بِهَا الثَّوَاب. (ج ۲۷، ص ۱۹۱)

یعنی ہم نے ان پر یہ فرض نہ کیا تھا کہ رہبانیت کی بدعت قائم کریں، مگر یہ کام انھوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ایجاد کیا تھا تاکہ وہ اس پر عمل کرکے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب کے حقدار بنیں۔ اور پھر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ان کی غرض پوری ہوئی تھی یا نہیں۔ ہاں! واقعی ان صالحین کی غرض پوری ہوئی۔ اس مطلب کے سمجھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ صالحین لوگوں کا یہی اعتقاد ہے کہ نیک بدعت کی ایجاد سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور اس بدعتِ حسنہ پر عمل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا کہ ہم نے اس پر عمل

کرنے والوں کو اجر دیا، یہ دلیل ہے کہ ان کا یہ اعتقاد صحیح تھا، جس کی وجہ سے وہ اجر کے حقدار بن گئے۔

اہلِ علم کے حضور شکل اوّل بالقیاس

صغریٰ	کبریٰ	نتیجہ
بَعْضُ بِدْعَاتٍ عَمِلَ بِهٖ الصَّالِحُوْنَ لِيَبْتَغُوْا بِهٖ رِضْوَانَ اللّٰه.	وَكُلُّ عَمَلٍ يُبْتَغٰى بِهٖ رِضْوَانُ اللّٰهِ فَهُوَ حَسَنٌ.	فَبَعْضُ بِدْعَاتٍ عَمَلَ بِهٖ الصَّالِحُوْنَ فَهُوَ حَسَنٌ.

ترجمہ: بعض بدعات پر صالحین عمل پیرا ہوئے تا کہ اس بدعت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان پر راضی ہو جائیں۔

پھر وہ عمل جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا تلاش کی جائے وہ حسن ہے۔ نتیجہ برآمد ہوا کہ بعض بدعات جن پر صالحین عمل پیرا ہوئے وہ حسن ہیں۔ پتہ چلا کہ بعض بدعات حسنہ بھی ہیں۔

مطلب سوم:

فَمَارَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا کا معنی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی آیتِ کریمہ میں اس بدعت پر رعایت کرنے والوں کو اجر کا حقدار فرمایا اور رعایت نہ کرنے والوں کو فاسق فرمایا۔ جب ہم فَمَارَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا کا صحیح معنی سمجھ لیں گے تو پھر اس مسئلہ کے سمجھنے کے لیے کوئی دشواری نہ ہوگی کہ مستحق اجر کون ہیں اور پھر فاسق کون ہیں؟ یقین جانیے کہ فَمَارَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس نیک بدعت پر عمل کرنا چھوڑ دیا جن کو اللہ تعالیٰ نے فاسق فرمایا اور جو لوگ عمل کرتے رہے حتیٰ کہ نبی آخر الزماں کی بعثت تک عمل پیرا رہے پھر وہی لوگ سرکارِ دوعالم پر ایمان لائے وہ اجر کے حقدار ہو گئے۔

اس آیت کی تفسیر مفسرین نے اس طرح پیش کی ہے:

۱. تفسیر مظہری، ج۹، صفحہ۲۳: حَقَّ رِعَايَتِهَا بَلْ ضَيَّعَهَا بَعْضُهُمْ بِتَرْكِ مَا الْتَزَمُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ رعایت نہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان میں سے بعض لوگوں نے اس بدعت ایجاد شدہ کو ضائع کر دیا جس چیز کو انھوں نے اپنے پر لازم کیا تھا اس کو ترک کر دیا۔

۲. تفسیر خازن، ج۷، صفحہ۳۲: ضَيَّعُوْهَا یعنی اس ایجاد شدہ بدعت کو ترک کر دیا۔

۳. تفسیر معالم التنزیل، ج۴، ص۱۳۳: اس ایجاد شدہ بدعت کو ترک کر دیا۔

۴. تفسیر قرطبی، ج۱۷، ص۲۶۳: فَمَارَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا اَیْ فَمَا قَامُوْا بِهَا حَقَّ الْقِيَامِ یعنی اس بدعت پر قائم نہ رہے۔

۵. تفسیر صاوی، ج۴، ص۱۵۰: فَمَارَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا اَیْ فَمَا قَامُوْا بِهَا حَقَّ الْقِيَامِ یعنی اس بدعت پر قائم نہ رہے۔

۶. تفسیر روح المعانی، ج۲۷، صفحہ۱۹۱: اَیْ مَا حَفِظُوْا عَلَيْهَا حَقَّ الْمُحَافَظَةِ یعنی انھوں نے خود ساختہ بدعت پر محافظت نہ کی۔

۷. تفسیر جمل، ج۴، ص۲۹۷: اَیْ مَاقَامُوْا بِهَا حَقَّ الْقِيَامِ یعنی اس رہبانیت مبتدعہ کو قائم نہ کیا۔

۸. روح المعانی، ج۲۷، ص۱۹۲: اِنَّ الَّذِيْنَ لَمْ يَرْعَوْا الرَّهْبَانِيَةَ حَقَّ رِعَايَتِهَا هُمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْهُ عَلَيْهِ الصَّلوٰةِ وَالسَّلام یعنی جن لوگوں نے اس بدعت رہبانیت پر عمل چھوڑ دیا تھا، یہی وہ لوگ تھے جو نبی آخر الزماں پر ایمان لانے سے محروم رہے اور نبی پاک کی تکذیب کی تھی۔

مطلب چہارم:

فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَجْرَهُمْ یعنی وہ لوگ مومن ہی تھے۔ نبی آخر الزماں پر ایمان لائے اور پھر رہبانیت بدعت پر عمل کرتے رہے۔ ہم نے ان کو اجر بخشا۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان وہ لوگ لائے جو لوگ اس بدعت پر عمل پیرا رہے، اس کا حوالہ بیان ہو چکا ہے۔ بہر حال اس بدعتِ حسنہ پر عمل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اجر عنایت فرمایا۔

اس آیت کی تفسیر مفسرین نے اس طرح پیش کی ہے:

۱. تفسیر روح المعانی، ج۲۷، ص۹۲-۱۹۱: ای فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اِيْمَاناً صَحِيْحًا بَعْدَ رِعَايَةِ رَهْبَانِيَّتِهِمْ اَجْرَهُمْ مَا يَخُصُّ بِهِمْ مِنَ الْاَجْرِ وَهُوَالْاَجْرُ عَلٰى مَاسَلَفَ مِنْهُمْ وَالْاَجْرُ عَلَى الْاِيْمَانِ یعنی ہم نے اجر بخشا اُن لوگوں کو جو کامل ایمان لائے اور اس رہبانیت مبتدعہ پر عمل کرتے رہے۔ ان کو اس رہبانیت مبتدعہ پر عمل کرنے کا اجر بھی بخشا اور پھر ایمان لانے کا اجر بھی بخشا۔

۲. تفسیر مظہری، ج۹، ص۲۳: اَجْرَهُمْ، اَیْ الْاَجْرُ الْمَوْعُوْدُ لَهُمْ عَلٰى حَسْبِ اَعْمَالِهِمْ فَمَنْ رَعٰى حَقَّ رِعَايَةِ التَّرْهِيْبِ كَمَا الْتَزَمَ اٰتَاهُ اَجْرَ عَمَلِهٖ یعنی ان کو ان کے اعمال کے مطابق اجر دیا۔ پس جس نے اس رہبانیت (مبتدعہ) کی مکمل رعایت یعنی محافظت کی اس کو ہم نے اس عمل کا اجر بخشا۔

اسی تفسیر مظہری ج۹ ص۲۰۴ پر حدیث حضرت عبداللہ سے مروی ہے کہ اسی بدعت پر استقامت کے بدلہ ان کو اجر ملا۔

۳. تفسیر خازن، ج۷، ص۳۳ پر حدیث شریف بروایت حضرت عبداللہ ابن مسعود موجود ہے۔ سرورِ عالم نے فرمایا: فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ، اَیْ مِنَ الَّذِيْنَ ثَبَتُوْا عَلَيْهَا اَجْرُهُم یعنی اہلِ ایمان جوان

میں سے تھے، جو اس بدعت رہبانیت پر ثابت قدمی کے ساتھ عمل پیرا رہے تھے، ہم نے اس کو اجر وثواب بخشا تھا۔ یہ حدیث معالم التنزیل ج ۴، ص ۱۳۴ پر موجود ہے۔

۴. معالم التنزیل، ج ۵، ص ۱۳۳: اَجۡرَهُمۡ، وَهُمُ الَّذِيۡنَ ثَبَتُوۡا عَلَيۡهَا یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اجر بخشا تھا جو لوگ اس بدعت رہبانیت پر ثابت قدم رہے تھے۔

۵. تفسیر صاوی، ج ۴، ص ۱۵۰: اَجۡرَهُمۡ، يَعۡنِى الَّذِيۡنَ ابۡتَدَعُوۡهَا اِبۡتِغَاءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ یعنی ان کو ہم نے اجر دیا جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اس بدعت کو ایجاد کیا تھا۔

٦. تفسیر قرطبی، ج ۱۷، ص ۲٦۴: اَجۡرَهُمۡ يَعۡنِى الَّذِيۡنَ ابۡتَدَعُوۡهَا اَوَّلاً وَرَعَوۡهَا یعنی ہم نے ان لوگوں کو اجر بخشا، جنھوں نے اس بدعت کو پہلے ایجاد کیا تھا اور پھر اس بدعت پر عمل کرتے رہے۔

اختصارِ مضمون کے پیشِ نظر چھ معتبر تفاسیر سے اس آیتِ کریمہ کا ترجمہ پیش کر کے ثابت کر دیا کہ جو لوگ نیک کام کی بدعت ایجاد کرتے ہیں وہ اجر کے حقدار ہیں اور پھر جو لوگ اس بدعت پر عمل کرتے ہیں وہ بھی ثواب کے حقدار ہیں۔ اگر ہر بدعت گمراہی ہوتی تو اس بدعتِ حسنہ کے ایجاد کرنے والے گنہگار ہوتے۔ جب قرآن پاک سے اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ بدعتِ حسنہ کی ایجاد کرنے والے اور اس پر عمل کرنے والے ثواب کے مستحق ہوئے تو ماننا پڑے گا کہ بعض بدعات حسنہ بھی ہیں، جن کے موجد اور عامل اجر کے حقدار بن جاتے ہیں۔

اھل علم کے - حضور باب القیاس شکل اوّل:

صغریٰ	کبریٰ	نتیجہ
بَعۡضُ الۡبِدۡعَاتِ الۡعَامِلُوۡنَ عَلَيۡهَا يَسۡتَحِقُّوۡنَ الۡاَجۡر. ترجمہ: بعض بدعات پر عمل کرنے والے ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔	وَكُلُّ عَامِلٍ يَّسۡتَحِقُّ عَلٰى عَمَلِهِ الۡاَجۡرَ فَهُوَ حَسَنٌ. ترجمہ: اور جس عمل پر عمل کرنے والے ثواب کے حقدار ہیں وہ عمل حسن ہے۔	فَبَعۡضُ الۡبِدۡعَاتِ حَسَنٌ. ترجمہ: پھر بعض بدعات حسنہ بھی ہیں۔

مطلبِ پنجم:

وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فَاسِقُوۡنَ یعنی ان میں سے کافی لوگ فاسق ہیں جنھوں نے اس رہبانیت بدعتِ حسنہ کو چھوڑ دیا تھا۔ دین عیسوی سے انحراف کر گئے تھے، یعنی اس بدعت پر عمل چھوڑ دینے والے فاسق تھے نہ کہ صالح تھے۔ پھر وہی لوگ نبی آخر الزماں پر ایمان لانے سے محروم رہے۔

اس آیت کی تفسیر مفسرین نے اس طرح پیش کی ہے:

۱. جمل، ج ۴، ص ۲۹۷: وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ. اَىۡ مِنۡ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيۡنَ ابۡتَدَعُوۡهَا وَضَيَّعُوۡهَا یعنی ان میں سے کافی لوگ وہ تھے جنھوں نے اس بدعت کی ابتدا کی پھر اس کو ضائع کر دیا یعنی اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ (وہ فاسق ہوئے)

۲. تفسیر مظہری، ج ۹، ص ۲۴: بدعت کو ترک کرنے والے آخرین میں سے تھے۔ وہ کیسے رہے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ. فَاسِقُوۡنَ. هُمُ الَّذِيۡنَ جَاؤُوۡ مِنۡ بَعۡدِهِمۡ یعنی کافی لوگ ان آخرین میں سے (جنھوں نے بدعتِ حسنہ کو ترک کر دیا تھا) فاسق ہیں۔

۳. روح البیان، ص ۳۸۳: وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ اَىۡ مِنَ الۡعِيۡسِيِّيۡنَ وَهُمُ الَّذِيۡنَ ابۡتَدَعُوۡ فَضَيَّعُوۡ وَكَفَرُوۡ مُحَمَّد عَلَيۡهِ السَّلام فَاسِقُوۡنَ یعنی یہی نصاریٰ تھے جنھوں نے بدعت کی ایجاد کی تھی۔ پھر اس بدعت کو ترک کر دیا تھا اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تھے، یہی لوگ فاسق ہیں۔

۴. تفسیر صاوی، ج ۴، ص ۱۵۰: وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ. اَىۡ مِنۡ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيۡنَ ابۡتَدَعُوۡهَا وَ ضَيَّعُوۡهَا فَاسِقُوۡنَ اَىۡ لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِنَبِيِّنَا یعنی ان لوگوں میں سے کافی ایسے لوگ تھے جنھوں نے اس بدعتِ رہبانیت کی ایجاد کی تھی اور پھر اس کو ضائع کر دیا۔ یعنی عمل کرنا چھوڑ دیا، فاسق ہوئے یعنی ہمارے نبی پر ایمان نہ لائے۔

۵. تفسیر خازن، ج ۷، ص ۳۲: وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فَاسِقُوۡنَ. وَ هُمُ الَّذِيۡنَ تَرَكُوۡا الرَّهۡبَانِيَّةَ وَكَفَرُوۡا بِدِيۡنِ عِيۡسٰى یعنی کافی لوگ ان میں سے فاسق ہو گئے، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے رہبانیت کو ترک کر دیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین سے منحرف ہو گئے تھے، کافر ہو گئے۔

٦. تفسیر معالم التنزیل، ج ۴، ص ۱۳۳: وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فَاسِقُوۡنَ. وَهُمُ الَّذِيۡنَ تَرَكُوۡا الرَّهۡبَانِيَّةَ وَكَفَرُوۡا بِدِيۡنِ عِيۡسٰى یعنی کافی لوگ ان میں سے فاسق ہو گئے جنھوں نے اس رہبانیت (مبتدعہ) کو چھوڑ دیا اور دین عیسیٰ علیہ السلام سے کافر ہو گئے۔ تفسیر بغوی نے بھی یہی معنی کیا ہے۔

۷. تفسیر کبیر، ج ۱۵، ص ۲۴۷: وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فَاسِقُوۡنَ. وَالۡمَعۡنٰى اَنَّ بَعۡضَهُمۡ قَامَ بِرِعَايَتِهَا وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ اَظۡهَرَ الۡفِسۡقَ وَ تَرَكَ تِلۡكَ الطَّرِيۡقَةَ ظَاهِراً وَ بَاطِنًا یعنی کافی لوگ ان میں سے فاسق ہو گئے۔ معنی یہ ہوا کہ ان میں سے بعض لوگ اس رہبانیت (مبتدعہ) پر قائم رہے اور کافی لوگ ان میں سے تھے جن میں فسق ظاہر ہو گیا اور اس طریقہ پر رہبانیت کو ظاہراً و باطناً ترک کر دیا۔

اختصارِ مضمون کے پیشِ نظر معتبر تفاسیر سے آیت کریمہ کے ضمن میں

ثابت کر دیا کہ بدعت حسنہ کے تارک فاسق ہی تھے نہ کہ صالح، کیونکہ صالحین اس پر عمل پیرا رہے تھے۔ قرآن مجید سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو بدعت حسنہ ہوتی ہے اس پر عمل کرنے والے صالح ہوتے ہیں اور جو لوگ فاسق ہیں، وہ اس بدعت کو چھوڑ دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بدعت سیئہ کا چھوڑنا ضروری ہے۔ اسی طرح بدعت حسنہ پر عمل ضروری ہے۔

مفسرین کرام کی نتیجہ خیز تحقیق:

اس آیت کریمہ میں مفسرین حضرات کی نتیجہ خیز تحقیقی تفسیر یہ ہے کہ بعض بدعات جو حسنہ ہیں ان پر عمل چھوڑ دینا عیب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی مذمت فرمائی ہے اور بدعت حسنہ پر عمل کرنا ضروری ہے۔

(۱) صاحب تفسیر روح المعانی، ج۲۷، ص۱۹۱ پر فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ذَمَّ لَهُمْ مِنْ حَيْثُ اَنَّ ذٰلِكَ كَالنَّذْرِ وَهُوَ عَهْدٌ مَعَ اللّٰهِ تَعَالٰى يُحِبُّ رِعَايَتَه' لَاسِيَّمَا اِذْ قَصَدَ بِهٖ رَضَاهُ عَزَّ وَجَلَّ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس بدعت حسنہ کے ترک کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے، اس لیے کہ یہ کام (اگرچہ بدعت ہے) مگر اللہ تعالیٰ سے وعدہ ہے مثل نذر کے تو پھر اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ خصوصاً جبکہ اس بدعت کی ایجاد اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کی گئی ہو، اس پر عمل واجب ہے۔

(۲) صاحب تفسیر روح المعانی، ج۲۷، ص۱۹۱ پر اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: وَيَسْتَحِقُّوْ بِهَا الثَّوَابَ وَمِنْ ضَرُوْرَةِ ذٰلِكَ اَنْ يُحَافِظُوْا عَلَيْهَا یعنی اُن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور استحقاق ثواب کی خاطر اس بدعت حسنہ کو ایجاد کیا تھا تو پھر اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کی حفاظت کرتے۔ تو ایسی بدعت حسنہ پر عمل کرنا ضروری ہوا جس کی ایجاد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور حصول ثواب کے لیے کی گئی ہو۔

(۳) صاحب روح المعانی ج۲۷، ص۱۹۲ پر كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: وَالَّذِىْ تَدُلُّ عَلَيْهِ ظَاهِرًا ذَمَّ عَدَمَ رِعَايَةِ مَاالْتَزَمُوْهُ یعنی اس آیت کریمہ میں ظاہراً ایسے لوگوں کی مذمت ہے، جنھوں نے بدعت حسنہ کو اپنے پر لازم کر کے پھر اس بدعت حسنہ پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ (ان کو فاسق کہا گیا) اللہ تعالیٰ کی جانب سے قابل مذمت ہیں۔

(۴) صاحب تفسیر قرطبی ج۱۷، ص۲۶۴ پر وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: وَهٰذِهِ الْاٰيَةُ دَالَّةٌ عَلٰى اَنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بدعة فينبغى لمن ابتَدَعَ خَيْرًا اَنْ يَّدُوْمَ عَلَيْهِ وَلَايَعْدِلُ عَنْهُ اِلٰى ضِدِّه. یہ آیت کریمہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جدید ایجاد کردہ عمل بدعت ہے۔ پس مناسب ہے کہ اگر بدعت حسنہ ہے تو اس پر دوام کرے، اس کو کبھی نہ چھوڑے۔

پھر آگے فرماتے ہیں: وَعَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ الْبَاهَلِىْ وَاسمه صُدَى بنُ عَجْلَان قَالَ: اَحْدَثْتُمْ قِيَامَ رَمَضَانَ وَلَمْ يَكْتُبْ عَلَيْكُمْ اِنَّما كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ فَدَاوِمُوْا عَلَى الْقِيَامِ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ ولاتتركوهُ فَاِنَّ نَاسًا مِنْ بَنِى اِسْرَائِيْلَ اِبْتَدَعُوْا بدعاً لم يكتبها اللّٰهُ عَلَيْهِمُ ابْتَغَوْا بِهَا رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَارَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَعَابَهُمُ اللّٰهُ بِتَرْكِهَا فَقَالَ: وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا اِلىٰ آخره. یعنی حضرت ابوامامہ الباہلی صحابی رسول فرماتے ہیں کہ: تم نے قیام رمضان (جماعت تراویح) کو خود ایجاد کیا، یہ بدعت ہے حالانکہ تمھارے پر فرض نہ تھا، تمھارے اوپر تو روزہ ہی فرض ہوا تھا، ہاں اب اگر تراویح کو خود ایجاد کر لیا، اب اس پر ہمیشہ عمل کرتے رہو، اس کو کبھی نہ چھوڑو۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے صالح لوگوں نے غیر مفروضہ عمل بدعت کا ایجاد اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کر کے پھر اس پر عمل چھوڑ دیا تھا۔ اس کا ترک کرنا اللہ تعالیٰ نے معیوب فرمایا۔ ارشاد ہوا: وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا آخر آیت تک ان کے اس عیب کا ذکر ہے۔

(۵) تفسیر درمنثور، ص۱۷۸ جلد ششم میں یہی حدیث حضرت ابی امامہ والی بتخریج سعید ابن منصور مذکور ہے۔ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب درمنثور رقم طراز ہیں: یعنی بدعت حسنہ پر عمل ترک کرنے والے پر اللہ تعالیٰ نے عیب فرمایا۔

(۶) تفسیر روح البیان، ج۹، ص۳۸۴: وَفِى الْاٰيَةِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الشُّرُوْعَ فِىْ نَفْلِ الْعِبَادَةِ مُلْزِمٌ وَ اِنَّ مَنْ شَرَعَ فِيْمَا لَيْسَ عَلَيْهِ ثُمَّ تَرَكَه' اِسْتَحَقَّ اِثْمَ الْفِسْقِ وَالْوَعِيْدِ یعنی اس آیت میں اس امر کی دلیل ہے کہ نیک کام کی ایجاد اور افتتاح کے بعد اس کی تکمیل ضروری ہے اور جس نے ایسی نیک بدعت کو شروع کر کے اس پر عمل چھوڑ دیا وہ فاسق کہلانے کا حقدار ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعید ہے۔

(۷) تفسیر روح البیان ج۹، ص۳۸۴: رُوِىَ عَنْ بَعْضِ الصَّحَابَةِ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ، عَلَيْكُمْ بِاِتْمَامِ هٰذِهِ التَّرَاوِيْحِ لِاَنَّهَا لَمْ تَكُنْ وَاجِبَةً عَلَيْكُمْ وَ قَدْ اَوْجَبْتُمُوْهَا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ فَاِنَّكُمْ اِنْ تَرَكْتُمْ صِرْتُمْ فَاسِقِيْنَ. ثُمَّ قَرَءَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ یعنی صحابۂ کرام سے مروی ہے کہ نماز تراویح اگرچہ تمھارے اوپر واجب نہ تھی تم نے خود ہی اپنے اوپر واجب کیا، اب اس کا اتمام تم پر عین لازم ہے، حتیٰ کہ اگر تم نے اس بدعت کو ترک کر دیا فاسق ہو جاؤ گے، پھر یہی آیت کریمہ پڑھی وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ یعنی قوم بنی اسرائیل بھی نیک بدعت پر عمل چھوڑ دینے کی وجہ سے فاسق ہو گئی تھی۔

(۸) تفسیر روح البیان، ج۹، ص۳۹۴: قَالَ بَعْضُ الْكِبَارِ: جَمِيْع

مَاابْتَدَعَ مِنَ السُّنَّةِ الْحَسَنَةِ عَلٰی طَرِیْقِ الْقُرْبَةِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالیٰ دَاخِلٌ فِی الشَّرِیْعَةِ الَّتِیْ جَاءَ تْ بِھَا الرُّسُلُ عَنْ اَمْرِ اللّٰہِ قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ: وَرَھْبَانِیَّةَ...... الخ فَاَقَرَّھُمْ تَعَالیٰ عَلَیْھَا وَلَمْ یَعِبْ عَلَیْھِمْ فِعْلَھَا اِنَّمَا عَابَ عَلَیْھِمْ عَدَمَ رِعَایَتِھِمْ لَھَا فِیْ دَوَامِ الْعَمَلِ فَقَطْ یعنی بزرگانِ دین نے فرمایا کہ: نیک کام کی بدعت جواللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر ایجاد کی گئی ہوانبیا کی شریعت جو کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اس میں داخل ہے۔اس کی دلیل یہی آیت وَرَھْبَانِیَّةَ الی آخرہٖ ہے۔اللہ تعالیٰ نے نیک بدعت پر عمل ان پر ضروری فرمایا۔عمل فرمانے والوں پر عیب بھی نہ فرمایا بلکہ عمل چھوڑ دینے پر عیب فرمایا۔

(۹) تفسیر روح البیان، ج،ص۳۸۴: نیک عمل کی ایجاد کو سابقہ امم کے لیے بدعت کہا گیا مگر ہمارے نبی علیہ السلام کی امت کے لیے اس بدعت کو سنت ہی کہا گیا۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:مَنْ سَنَّ فِی الْاِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً......الخ (رواہ مسلم) فَاَجَازَ لَنَا ابْتَدَاعُ مَاھُوَ حَسَنٌ وَ سَمَاہ سُنَّة وَجَعَلَ فِیْہِ اَجْراً لِمَنِ ابْتَدَعَه' وَلِمَنْ عَمَلَ بِہٖ. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث صحیح سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ سرورِ کائنات نے نیک بدعت کی ایجاد کو جائز فرمایا اور ایسی بدعت کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت فرمایا اور اس بدعت پر عمل کرنے والے اور اس کی ابتدا کرنے والے کو ثواب اور اجر کا حقدار فرمایا۔

پھر آگے فرماتے ہیں:اِنْ خَالَفَ صَرِیْحَ السُّنَّةِ فَان لَّمْ یُخَالِفُھَا فَھُوَ مَحْمُوْدٌ یعنی بری بدعت وہ ہے جو حضور سرورِ کائنات کی سنت کے خلاف ہو۔ اگر شریعتِ مطہرہ کے خلاف نہیں ہے ایسی بدعت محمود ہے یعنی بہترین عمل ہے۔

قرآن شریف اور بدعت:

قرآن پاک کی اس آیتِ کریمہ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ:

(۱) بدعتِ حسنہ کا وجود شریعتِ مطہرہ میں مستحسن ہے۔(۲) بدعتِ حسنہ کی ایجاد صالحینِ امت ہی فرمایا کرتے ہیں۔(۳) بدعتِ حسنہ پر ہمیشہ عمل کرنا ضروری ہے۔ (۴) بدعتِ حسنہ پر عمل کرنے والے ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔(۵) بدعتِ حسنہ کو پھر ترک کرنے والے فاسق ہی ہوتے ہیں۔ (۶) بدعتِ حسنہ کا ترک کرنا عنداللہ عیب ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت فرمائی ہے اور پھر خود قرآن پاک کی موجودہ کتابی ترتیب اور اس کے پارہ ہاو رکوع وغیرہ کی تقسیم اور اس قرآن پاک پر اعراب کا ہونا وغیرہ یہ سب کچھ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مقدس کے بعد ایجاد ہوا۔تمام قسم کی بدعت کو گمراہی کہنے والے مدعی کو ذرا سوچنا نصیب ہو تو سوچ سکتا ہے اور پھر کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب جس کو مسلمان قیامت تک پڑھتے رہیں گے،ان بدعات میں موصوف ہے۔کیا یہ پھر گمراہی ہے؟نَعُوْذُ بِاللّٰہ! جو قیامت تک قرآن پاک میں جاری رہے گی۔فَاعْتَبِرُوْا یَااُوْلِی الْاَلْبَاب.

احادیثِ رسول، آثارِ صحابہ اور اقوالِ فقہاء سے بدعتِ حسنہ کا ثبوت:

(۱) مسلم شریف، ج۱،ص۳۲۷:مَنْ سَنَّ فِی الْاِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَه' اَجْرُھَا وَ اَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِھَا بَعْدَہ' مِنْ غَیْرِ اَن یَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِھِمْ شَیْئٌ یعنی فرمایا رسول اللہ نے: جس نے اسلام میں جدید نیک سنت قائم کی اس کے لیے اس کا ثواب اور بعد میں اس پر عمل کرنے والوں کا ثواب بھی اسے بغیر کسی کمی کے ملے گا۔خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک بدعت کو سنت فرمایا اور پھر نیک بدعت پر عمل کرنے والے کو مستحقِ ثواب فرمایا۔

(۲) بخاری شریف، ج۲،ص۷۴۵: جنگِ یمامہ میں مسیلمہ کذاب قتل کیا گیا۔ اس میں جب صحابۂ کرام شہید ہونے لگے تو حضرت عمر نے خلیفۃ المومنین حضرت ابوبکر صدیق سے کہا کہ قرآن جمع کرنے کا اہتمام کیا جائے تو حضرت صدیق اکبر نے جواباً فرمایا: کَیْفَ تَفْعَل شَیْئاً لَمْ یَفْعَلْه' رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟ اے عمر! ایسا کام کیسے کرتا ہے جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہے؟ حضرت صدیق اکبر کا یہ فرمان اس عقدہ اور اعتراض کو حل کر دینے کے لیے صراحتاً بنیاد تھی تا کہ اگر کسی زمانہ میں ہی اہلِ اسلام میں یہ مسئلہ پیدا ہونے لگے کہ (جو کام رسولِ خدا نے نہیں کیا اُس کا کرنا جائز نہیں) اس مسئلہ کا حل آسمانِ رُشد و ہدایت کے ستارے، درسِ نبوت میں تعلیم پانے والے صحابۂ کرام کے اجتماعی فیصلہ سے واضح ہو جائے۔قَالَ عُمَرُ ھٰذَا وَاللّٰہِ خَیْرٌ یعنی حضرت عمر ناطق بالصدق والصواب جن کی رائے کان موافقاً للکتاب تھی،انھوں نے حلفیہ بیان فرمایا،یعنی اللہ کی قسم! یہ کام (اگرچہ جدید ہے، بدعت ہے) مگر خیر ہے۔یعنی حسن اچھا ہے تو حضرت عمر نے قرآن پاک جمع کرانے کے جواز کا ثبوت بدعتِ حسنہ کہہ کر پیش کیا، جس کی بنیاد پر حضرت صدیق اکبر نے فرمایا کہ جس مسئلہ میں حضرت عمر کا سینہ روشن ہوا تھا اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرا سینہ بھی کھول دیا۔اجماعِ صحابہ نے فیصلہ کیا کہ واقعی یہ کام اگرچہ بدعت ہے مگر ضروری ہے اور اچھا ہے، حسن ہے۔مسلم شریف ج۱،ص۳۲۷ پر شارع مسلم علامہ نووی اس حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں: بدعت کی پانچ قسم ہے: (۱) بدعتِ واجبہ (۲) مندوبہ (۳) محرمہ (۴) مکروہہ (۵) مباحہ۔

فقہ حنفیہ کی معتبر اور مشہور کتاب ردّ المحتار ج۱،ص۳۷۶ پر بدعت کی پانچ قسمیں یہ بیان کی گئی ہے:

(۱) **بدعت واجبہ** : کَنَصَبِ الْاَدِلَّۃِ لِلرَّدِّ عَلٰی اَھْلِ الْفِرَقِ الضَّالَّۃِ وَتَعَلُّمِ النَّحْوِ الْمُفْھِمِ لِلْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ یعنی پہلی قسم بدعت واجبہ جیسا کہ گمراہ فرقوں کے لیے دلائل تجویز کرنا اور علم نحو سیکھنا جس سے قرآن وحدیث سمجھ آئے۔

(۲) **بدعت مندوبہ** : کَاِحْدَاثِ نَحْوِ رِبَاطٍ وَ مَدْرَسَۃٍ وَّ کُلِّ اِحْسَانٍ لَمْ یَکُنْ فِی الصَّدْرِ الْاَوَّلِ یعنی دوسری قسم بدعت مندوبہ مستحبہ ہے جیسے مسافر خانہ اور مدرسہ بنانا اور ہر نیک کام کی ابتدا جو کام زمانۂ اوّل میں نہ تھا۔

(۳) **بدعت مکروھہ** : کَزَخْرفۃِ الْمَسَاجِدِ یعنی بدعت مکروہہ جیسے تزئین مساجد، رنگریزی، سجاوٹ وغیرہ۔

(۴) **بدعت مباحہ** : کَالتَّوَسُّعِ بِلَذِیْذِ الْمَاکَلِ وَالْمَشَارِبِ وَالثِّیَابِ یعنی بدعت مباحہ جیسا کہ لذیذ کھانے پینے کی اشیا اور اچھے لباس کی توسیع وغیرہ۔ مشروبات سیون اَپ، شیزان، فانٹا، پیپسی، جامِ شیریں، کڑھائی گوشت، قورمے، جلیبی، گلاب جامن وغیرہ ماکولات ومشروباتِ جدیدہ جو کہ سرکارِ دوعالم کے زمانہ میں نہ تھے۔ اسی طرح ملبوس بوسکی، ٹیرا ویرا، ٹیٹران، لٹھا وغیرہ یہ سب بدعاتِ مباحہ ہیں۔

(۵) **بدعت محرمہ** : وَھِیَ اِعْتِقَادُ خِلَافِ الْمَعْرُوْفِ عَنِ الرَّسُوْلِ لَابِمُعَانَدَۃٍ بَلْ بِنَوْعِ شُبْھَۃٍ یعنی بدعت محرمہ جیسا کہ نیک کام جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا اس کے خلاف اعتقاد رکھنا یہ مخالفت، دشمنی اور عناد کی وجہ سے (جو کہ کفر ہے) نہ ہو بلکہ شبہ کی وجہ سے ہو تو یہ بدعت محرمہ اور سیئہ ہے۔

مذکورہ دلائل حدیث شریف، صحابۂ کرام کا عمل اور فقہا ومفسرین کے اقوال سے ثابت ہوا کہ تمام بدعات بری نہیں بلکہ بعض حسن، مباح وغیرہ بھی ہیں۔ ہاں! ضد کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔

اھل اسلام میں بدعات کی ترویج:

اگر تمام بدعات ناجائز اور گناہ ہیں تو پھر بعض بدعات کی ترویج اہلِ اسلام میں کیوں؟ کچھ ایسی بدعات کی نشاندہی لازم ہے، جن پر قائلین اور منکرین عمل پیرا ہیں۔

☆ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، ج۲، ص۲۲۴: لِاَنَّ الْمَحَارِیْبَ مِنَ الْمُحْدَثَاتِ بَعدہ یعنی مسجدوں میں تعمیر شدہ محراب بھی محدثات یعنی بدعات میں سے ہیں جو کہ ہر مکتبِ فکر کی مساجد میں بھی موجود ہیں۔ اگر مدعی کے اس قول کو صحیح مانا جائے کہ واقعی ہر جدید کام گمراہی ہے تو ان حضرات نے گمراہی سے بچنے کے لیے اپنی مساجد میں سے محراب تعمیر شدہ کو کیوں نہ تڑوا دیا۔ ایسی گمراہی کو اپنی عبادت گاہوں میں کیوں رہنے دیا؟

☆ حاشیہ ردّ المختار ج۱، ص۲۶۱ میں ہے: اَلتَّسْلِیْمُ بَعْدَ الْاَذَانِ الخ بِدْعَۃٌ حَسَنَۃٌ وَکَذَا الْاَذَانُ بَیْنَ یَدَیِ الْخَطِیْبِ یعنی اذان کے بعد نبی پاک کی ذات پر باآواز بلند سلام پڑھنا بدعتِ حسنہ ہے۔ اسی طرح جمعہ کے دن خطیب کے سامنے اذان دینا بھی نیک بدعت ہے، مگر منکرین نے آج تک اپنی عبادات اور عبادت گاہوں میں سے اس بدعت کا خاتمہ نہ کر کے اس امر کا ثبوت قائم کر دیا کہ تمام بدعات گمراہی نہیں ہیں بلکہ بعض بدعات حسنہ بھی ہیں۔ صاحب ردّ المختار نے بھی یہی فیصلہ فرمایا۔ ج۱، ص۲۶۱ پر رقم طراز ہیں: وَکَذَالِکَ نَقُوْلُ فِی الْاَذَانِ بَیْنَ یَدَیِ الْخَطِیْبِ فَیَکُوْنُ بِدْعَۃً حَسَنَۃً اِذَا مَارَاٰہُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَسَناً فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ حَسَنٌ۔ یعنی اسی طرح ہم کہیں گے کہ خطیب کے سامنے جمعہ کی اذان بدعتِ حسنہ ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: مؤطا امام محمد میں بھی یہ حدیث موجود ہے کہ جو نیک کام جس کو اہلِ ایمان اچھا اور نیک سمجھیں وہ کام عنداللہ بھی نیک اور اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح مساجد کی تزئین اور پھر اسی طرح مرگی والے پر اذان، آگ لگنے پر اذان اور قبر پر اذان دینا، بلکہ اس کو صاحب ردّ المختار نے سنت فرمایا۔ (حوالہ کے لیے دیکھیں ردّ المختار ج۱، ص۲۵۸) اسپیکر میں اذان، اسپیکر پر جماعت، موجودہ سیاسی سرگرمیاں اور مدارس میں مروّجہ نصابِ تعلیم صرف، نحو، منطق، سائنس، جغرافیہ وغیرہ تمام علوم جو کہ سیّد الانبیا کے زمانہ میں ایجاد بھی نہ ہوئے تھے اب قائلین ومنکرین اس پر عمل پیرا ہیں۔ یہ بدعاتِ حسنہ ہیں۔ اسی طرح اصحابِ اربعہ ودیگر صحابہ کا نام خطبہ میں پڑھنا۔

اَلْحَمْدُلِلّٰہ! ہم نے قرآن وحدیث اور فقہ اور منکرین کے اپنے مروّجہ اعمال وافعال سے جامع مانع دلائل پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ تمام بدعات گمراہی نہیں۔ یہ امتِ مسلمہ کو گمراہ کرنے کی ایک سازش ہے، بلکہ بعض بدعات جو کہ خلافِ سنت اور خلافِ شرع نہ ہوں اور ان میں نیکی ہو یا پھر امتِ مسلمہ کے لیے بہتری ہو ایسی بدعات اچھی ہیں۔

منکرین بدعت حسنہ کے مغالطات سے پردہ کشائی

(۱) **مغالطہ اوّل**: قرآن پاک کی جس آیت سے بدعتِ حسنہ کا ثبوت پیش کیا اس میں عیسیٰ علیہ السلام اور انبیائے سابقین کی امت کی بدعات کا ذکر ہے، لہٰذا خاتم الانبیا کی امت کے لیے اس آیت کو دلیل بنانا جائز نہیں ہے۔ سبحان اللہ! بریں عقل ودانش بباید گریست۔ حق پر پردہ پوشی کی ایک عظیم مثال ہے۔

وجہ اوّل: یہ کہ یہ عمل گمراہی کیا کوئی گمراہ عمل کسی امتِ مسلمہ کے لیے مختص ہوا کرتا ہے یا تو قرآن شریف اور حدیث پاک میں ایسی دلیل مل جائے کہ سابق امت کے لیے جائز و باعث اجر تھا۔ اب امتِ محمد یہ علیہ التحیہ کے لیے گناہ ہے اگر اس بات کا ثبوت قرآن وحدیث میں کہیں بھی نہیں۔ تو ماننا

پڑے گا کہ سابقہ امت کے لیے جس طرح یہ عمل باعثِ ثواب تھا، نبی آخرالزماں کی امت کے لیے بھی باعث اجر ہے۔

وجہ دوم: قرآن پاک کی تفسیر اور تعبیر کے لیے نبی علیہ السلام بطریق کمال عالم ہوتے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ حکم امت محمد یہ علیہ افضل التحیہ کی خاطر منسوخ ہوتا تو سرکارِ دوعالم مَنْ سَنَّ فِی الْاِسْلامِ سُنَّةً حَنَسَةً نہ فرماتے۔ یعنی جس نے نیک کام کی ایجاد کی اس کے لیے اس کا ثواب اور اس پر عمل کرنے والے کا ثواب ہوگا۔ نبی علیہ السلام نے تو نیک کام کی تجدید، تحدیث اور بدعت کو ثواب کا موجب فرما کر یہ واضح کر دیا کہ بدعت حسنہ کی ایجاد امتِ مسلمہ کے لیے منسوخ نہیں ہے اور فقط سابق امت کے لیے مختص نہیں ہے۔

وجہ ثالث: یہ آیتِ کریمہ سورہ حدید میں ہے۔ مفسرینِ کرام بحث ناسخ و منسوخ میں یہ فرماتے ہیں کہ سورہ حدید میں کوئی آیت ناسخ اور منسوخ نہیں ہے۔ کتاب الناسخ والمنسوخ مصنفہ ابوالحسن نیشاپوری علیٰ حاشیہ اسباب النزول، صفحہ ۲۹۸ سورہ حدید کے آخر میں رقم طراز ہیں: وَلَیْسَ فِیْهَا نَاسِخٌ وَلَا مَنْسُوْخٌ یعنی اس سورہ میں کوئی آیت نہ ناسخ ہے نہ منسوخ ہے۔ منکرین کے لیے یہ مغالطہ تھا جس کو واضح کر دیا گیا۔

(۲) **مغالطہ دوم**: اہلِ ایمان سادہ دل لوگوں کو غلطی میں شکار کرنے کی ایک سازش بناتے بناتے خود منکرین غلطی کے شکار ہو گئے۔ کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ یعنی نبی علیہ السلام نے فرمایا: تمام بدعت گمراہی ہے۔ حدیث شریف کے مقصد کو سمجھنے کے لیے مطالعہ کی بیحد ضرورت ہوتی ہے۔ کُلُّ بِدْعَةٌ میں جدید ہر بدعت مراد نہیں ہے بلکہ بدعت مذمومہ مراد ہے۔ اگر کُلُّ بِدْعَةٌ میں تمام جدید کام چاہے نیک ہوں یا نہ ہوں شامل ہوتے تو درسِ نبوت میں کامیاب ہونے والے ناطق بالصدق والصواب حضرت عمر نمازِ تراویح کی جماعت دیکھ کر یہ نہ فرماتے کہ: نِعْمَت هٰذِهِ البَلاغة (مشکوٰۃ، ص ۱۱۵) یعنی یہ بدعت بہت اچھی ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت عمر کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ بعض بدعات حسنہ بھی ہیں۔ اس حدیث کی تشریح میں شارح مشکوٰۃ صاحبِ مرقاۃ ج ۳، ص ۱۹۲ پر رقم طراز ہیں: وَسَنَّهَا عَلٰی الدَّوَامِ فَعَلَه' اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا اِلیٰ یَوْمِ الْقِیَامَةِ یعنی حضرت عمر نے اس بدعت کی ایجاد کو ہمیشہ کے لیے مسنون فرمایا اس لیے ان کے لیے اس کا اجر اور اس پر عمل کرنے والوں کا اجر قیامت تک ملتا رہے گا۔ کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ میں حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے۔ یعنی ہر جدید کام چاہے نیک ہو چاہے برا گمراہی نہیں بلکہ ایسا جدید کام جو خلافِ سنت ہو وہ گمراہی ہے یا یہ حکم عام مَخْصُوْص عَنْهُ الْبُعْض ہے۔

(۳) روح المعانی ج ۲۷، ۱۹۲: کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ مِنَ الْعَامِ الْمَخْصُوْصِ یعنی کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ عام مخصوص عنہ البعض ہے۔ یعنی نبی علیہ السلام کا یہ فرمان کہ ہر بدعت گمراہی ہے اگرچہ عام ہے مگر بعض بدعات مخصوص ہیں جو کہ اس عام حکم سے خارج ہیں، وہ گمراہی نہیں ہیں۔ فقط ایسی بدعات گمراہی ہیں جو خلافِ سنت ہوں۔

(۴) مسلم شریف، ج ۱، ص ۳۲۷ پر حدیث مَنْ سَنَّ فِی الْاِسْلامِ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ نووی رقم طراز ہیں: وَفِی الْحَدِیْثِ تَخْصِیْصُ قَوْلِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم کُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَکُلُّ بِدْعَةٌ ضَلَالَةٌ وَاَنَّ الْمُرَادَ بِهِ الْمُحْدَثَاتُ الْبَاطِلَةُ وَالْبِدَعُ الْمَذْمُوْمَةُ یعنی حدیث "مَنْ سَنَّ فِی الْاِسْلام" جو ہے یہ حدیث "کُلُّ بِدْعَةٍ ضَالَّةٌ" والی کے لیے مخصص ہے۔ یعنی کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ میں ہر بدعت مراد نہیں، بلکہ فقط ایسی بدعات مراد ہیں جو باطل ہوں، مذمومہ ہوں، بری ہوں، یعنی خلافِ شرع، خلافِ سنت ہوں، ایسی بدعات گمراہی ہیں۔ من سنّ فی الاسلام اس حدیث نے بدعات حسنات کی تخصیص کر دی ہے۔ پھر بدعاتِ حسنات اسلام میں گمراہی نہیں قرار پائیں گے۔

اختصار مضمون کے پیشِ نظر فقط پانچ معتبر حوالہ جات کے ذریعہ حدیث رسول کی روشنی سے ثابت کر دیا کہ کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ میں تمام بدعات چاہے برے ہوں یا اچھے ارادہ کرنا جاہلانہ مغالطہ ہے۔ جب سرکارِ دوعالم نے نیک بدعات کے بارے میں خود فرما دیا کہ موجبِ ثواب ہیں تو پھر کُلُّ بِدْعَةٍ میں فقط مخصوص وہی بدعات ہیں جو کہ مذموم ہیں وہ گمراہی ہیں۔

قرآن اور عام مخصوص عنه البعض:

بعض عناصر اپنے غلط مقصد کو صحیح باور کرانے کی مذموم کوشش میں اہلِ حق پر اتہام تراشی کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ حکم عام کو خاص کرنا یہ خودساختہ مطلب ہے خواہ مخواہ چند ایک کتب کے حوالہ پیش کر کے اپنے خودساختہ معنی کو صحیح کرنے کی کوشش ہے۔ اہلِ حق پر اس تہمت کا خاتمہ قرآن پاک کی آیات سے کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ سادہ دل مسلمان پھر کسی قید تزویر میں نہ پھنس جائیں۔

جاننا چاہیے کہ قرآن پاک میں حکم عام کو خاص کرنے کی کافی مثالیں آیات میں موجود ہیں، جو کہ چار قسم پر مبنی ہیں:

۱. قرآن پاک میں حکم عام کی تخصیص قرآن پاک کی دوسری آیت سے۔
۲. قرآن پاک میں حکم عام کی تخصیص حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔
۳. قرآن پاک میں حکم عام کی تخصیص اجماعِ امت سے۔
۴. قرآن پاک میں حکم عام کی تخصیص قیاسِ صحیح سے یعنی قرآن اور حدیث کی روشنی سے قیاس کرنا۔

قسم اوّل: قرآن پاک کے حکم عام کی تخصیص دوسری آیت سے پہلی مثال: اَلْمُطَلَّقَاتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو عورتیں طلاق شدہ ہوں، وہ تمام عورتیں اپنی عدت تین حیض پوری کریں۔ اب اس آیت میں حکم عام ہے یعنی جس قسم کی بھی عورت ہو وہ اپنی عدت تین حیض پوری کرے، مگر قرآن پاک کی دوسری آیت سے اس عام حکم میں تخصیص ہوگئی۔ بتایا گیا کہ بعض عورتیں اس حکم میں شامل نہیں۔ ان کی عدت تین حیض نہیں۔ ان میں ایسی عورتیں ہیں جو حاملہ ہوں۔ فرمایا اللہ نے: وَاُوْلَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ یعنی حمل والی عورتیں ان کی عدت تین حیض نہیں بلکہ وضع حمل ہے۔ اور پھر ایسی عورتیں جو غیر مدخولہ ہوں، فرمایا اللہ نے: اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ یعنی جو غیر مدخولہ عورتیں ہیں ان کی عدت بھی تین حیض نہیں بلکہ ان کی عدت کچھ بھی نہیں ہے۔

دوسری مثال: اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ یعنی زانی مرد یا زانیہ عورت، ان تمام کے لیے حد شرعی یہ ہے کہ ایک سو کوڑے لگائے جائیں۔ یہاں لفظ كُلَّ وَاحِدٍ ہے۔ جس طرح كُلُّ بِدْعَةٍ میں بھی لفظ كُلُّ ہے، مگر باوجود حکم عام کے زرخرید لونڈیاں جو ہیں قرآن پاک کی دوسری آیت کے ساتھ اس حکم سے مستثنیٰ اور خارج ہیں۔ اللہ کا ارشاد ہے: فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ یعنی لونڈیوں کو سو کوڑے نہ لگائے جائیں۔ ان کے لیے حد شرعی نصف ہے یعنی پچاس کوڑے۔

تیسری مثال: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ یعنی اے ایمان والو! تمھیں جو عورتیں اچھی لگیں ان سے نکاح کر سکتے ہو چاہے دو سے یا تین سے یا چار سے نکاح کرو۔ اب یہ حکم عام ہے، جس عورت سے بھی جی چاہے نکاح کرو، مگر قرآن میں دوسری آیت سے اس حکم عام کو خاص کر دیا: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ الٰی آخر الآیۃ یعنی اپنی ماؤں سے اور تمام محرمات سے نکاح نہ کرو۔ یہ عورتیں نکاح میں نہیں لا سکتے ہو۔ حکم عام کو خاص کر دیا گیا۔

چوتھی مثال: وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا یعنی اگر تم نے اپنی کسی منکوحہ کو حق مہر میں کثیر مال بھی دیا ہے تو تم ان سے واپس نہیں لے سکتے ہو۔ مگر دوسری آیت سے خلع کرنے والی عورت مخصوص ہوگئی: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ یعنی خلع کی صورت میں گناہ نہیں ہے۔ اگر عورت مرد کو مال واپس کر دے، مرد لے سکتا ہے۔ اب حکم عام مخصوص ہو گیا۔ یعنی فقط بغیر خلع اور عورت کی رضا کے تم نہیں لے سکتے ہو۔

پانچویں مثال: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ یعنی تمھارے اوپر تمام قسم کا میتہ غیر مذبوحہ اور ہر قسم کا خون حلال جانور کا حرام کر دیا گیا ہے۔ مگر دوسری آیت میں فرمایا: اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ یعنی صید البحر مچھلی بغیر ذبح کے حلال کر دی گئی ہے۔ اب بعض غیر مذبوحہ شکار اس حکم سے خارج ہو گیا۔ پھر فرمایا: دَمًا مَّسْفُوْحًا یعنی خون جاری چاہے حلال جانور کا ہو تمھارے لیے حرام ہے۔ اب تمام قسم کا خون حرام نہ رہا، بلکہ مخصوص دم مفسوح ہی حرام رہا۔ خون جامد جو جاری نہیں تھا وہ حلال ہے۔

اختصارِ مضمون کے تحت پانچ مثالیں قرآن پاک کی آیات سے پیش کر کے ثابت کر دیا کہ عام مخصوص عنه البعض قرآن پاک میں بھی موجود ہے۔ یہاں آیتِ قرآنی سے آیتِ قرآنی کی تخصیص ہے۔

قسم دوم: (قرآن میں حکم عام کی تخصیص حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے)

۱۔ مثال اوّل: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ یعنی تمام قسم کی بیع تمھارے لیے حلال ہے۔ مگر حدیث شریف سے ثابت ہے بیع فاسد جائز نہیں۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم عام جو کہ حَلَّتْ ہے اس کو خاص کر دیا گیا۔ اب بیع فاسد اگرچہ بیع ہے یہ جائز نہ رہی۔

۲۔ دوسری مثال: قرآن پاک میں ہے: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ یعنی تمام شرعی وارث وراثت کے حق دار ہیں، مگر حدیث شریف سے ثابت ہے کہ قاتل مورث وراثت سے محروم، مخالف فی الدین وراثت سے محروم ہیں۔ حکم عام میں تخصیص ہوگئی۔ اسی طرح انبیا کی وراثت نہ ہونا حکم عام کی تخصیص ہے۔

۳۔ تیسری مثال: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ یعنی غیر مذبوحہ حرام ہیں، مگر مکڑی کے بارے میں حدیث موجود ہے اس کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اگرچہ غیر مذبوحہ ہے حرام نہیں حلال ہے۔

اختصارِ مضمون کے پیشِ نظر تین مثالیں پیش کر کے ثابت کر دیا کہ قرآن پاک میں حکم عام کی تخصیص حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔

قسم سوم: (قرآن پاک میں حکم عام کی تخصیص اجماعِ امت سے)

۱۔ مثال اوّل: يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ الخ آیتِ وراثت سے ثابت ہے کہ ورثا وراثت کے حقدار ہیں، مگر اجماع نے تخصیص کر دی کہ عبد وارث باوجود وارث ہونے کے محروم ہے۔

قسم چہارم: (قرآن پاک میں حکم عام کی تخصیص قیاس صحیح سے)

۱۔ مثال اوّل: فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ تمام قسم کے لوگوں کے لیے حد شرعی زنا کی سو کوڑے ہیں، مگر عبد زرخرید کے لیے یہ حکم نہیں۔ کیونکہ قرآن پاک میں لونڈی زرخریدہ کے لیے آدھی سزا کا حکم ہے

اسی پر قیاس کر کے حکم دیا گیا کہ عبد زرخرید کے لیے بھی یہی آدھی سزا ہے۔
اگر چہ آیت کریمہ میں لفظ کُلّ وَاحِدٍ موجود ہے جس طرح کُلُّ بِدْعَةٍ کی تخصیص اگر حدیث شریف مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَام سے ہو جائے تو یہی مقصد کیونکر صحیح نہیں ہے۔

تِلْکَ عَشَرَةٌ کَامِلَةٌ. اختصارِ مضمون کے پیشِ نظر قرآن پاک میں سے فقط دس مثالیں پیش کر کے ثابت کر دیا کہ قرآن پاک میں حکم عام کی تخصیص قرآن سے بھی جائز، حدیث شریف سے بھی جائز، اجماعِ امت سے بھی جائز، قیاس سے بھی صحیح ہے۔ افسوس کہ مدعی اپنی مکمل کوشش کے باوجود خود ساختہ مقصد تک نہ پہنچ سکا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

اھل علم کے حضور:

کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَة کی معنوی ترکیب اور صحت معنی کے بارے میں مختصر عندیہ اگر لفظ 'کُل' میں حصر حقیقی ہو تو صفت تقیید یہ محذوف یعنی کُلُّ بِدْعَةٍ سَيِّئَةٍ ضَلَالَةٌ اگر حصر اضافی ہو تو صفت موضحہ لفظ سیئۃ محذوف ہے۔ بہر نوع بحذف صفت سیئۃ معنی صحیح ہو جائے گا۔

التزام مالایلزم اور فرمانِ نبوت:

یعنی جو حکم شریعتِ پاک میں لازم نہیں کیا گیا اگر یہ کام برا نہ ہو تو کوئی شخص اپنے پر لازم کر دے (جیسا کہ بدعتِ حسنہ پر لزوم) تو اس کے بارے میں خود نبی علیہ السلام نے کیا فیصلہ فرما دیا۔ اس مسئلہ کے ثبوت کے لیے حدیث بخاری پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں تا کہ بخاری شریف کے ماننے والوں کے لیے تو باعثِ ہدایت ہو جائے۔

بخاری شریف، ج۱، ص۱۰۷: انصاری صحابی رسول حضرت کلثوم بن ہدم جو کہ نبی علیہ السلام کے مقدس زمانے میں مسجد قبا شریف کے امام تھے۔ تمام انصارِ مدینہ ان کو سب سے افضل سمجھتے تھے، مگر ہر نماز میں جب فاتحہ کے بعد سورہ پڑھتے تو سورہ پڑھنے سے پہلے ہمیشہ ہر رکعت میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد پڑھتے تھے۔ نبی علیہ السلام کی خدمت میں اس بارے میں عرض کیا گیا تو حضور علیہ السلام نے اس امام قبا سے فرمایا: مَا يَحْمِلُکَ عَلٰى لُزُوْمِ هٰذِهِ السُّوْرَةِ؟ یعنی جبکہ شریعت میں یہ لازم نہیں ہے مگر کون سی چیز نے اس سورہ پاک کے پڑھنے کو تم پر لازم کر دیا ہے؟ یعنی جو چیز تم پر شرعاً ضروری نہیں ہے تم نے اپنے اوپر کس لیے لازم کر دیا ہے؟ فَقَالَ: اِنِّیْ اُحِبُّهَا عرض کیا اس وجہ سے میں نے اپنے اوپر لازم کیا ہے کہ مجھے سورہ اخلاص سے پیار ہے۔ پھر چونکہ اس عمل کے لزوم کرنے کا سبب محبت قرآن تھی تو نبی علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا: حُبُّکَ اِيَّاهَا اَدْخَلَکَ الْجَنَّةَ یعنی تم نے سورہ اخلاص سے محبت کی، تیرا مقام جنت ہو گیا۔ سبحان اللہ! قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے سرکارِ دو عالم کا یہ فیصلہ باعثِ بشارت ہے۔ اگر کسی نیک غرض کے سبب غیر لازم عمل کو اپنے اوپر لازم کر لے وہ بہشت میں پہنچ ہی گیا ہے۔ تو جس عمل (بدعت) کی ایجاد ارادۂ نیکی کے لیے ہو، اس حدیث سے ثابت ہوا کہ وہ بہشت کا حقدار ہو گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس حدیث شریف کے پڑھنے کے باوجود بھی کسی نیک عمل کو اپنے اوپر لازم کرنے والے کو روکتا ہے گویا کہ وہ مسلمانوں کے لیے بہشت کے دروازے بند کرانا چاہتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے لیے مخلص نہیں ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے آدمی کی صحبت سے بچیں اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کریں۔ بشرطیکہ اس لزوم کو فرض شرعی یا واجب شرعی اعتقاد نہ کریں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰه! جامع مانع انداز میں ثابت کر دیا کہ بری بدعت سے بچنا ضروری ہے اور نیک بدعت کی ایجاد صالحین کی سنت ہے۔ موجبِ ثواب ہے۔ موجبِ دخولِ جنت ہے، اس پر عمل کرنا اہلِ ایمان کا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین بحق سیّدالمرسلین صلی اللّٰہ علیہ وسلم.

شریعت مطھرہ میں اھل ایمان کی رائے پر تبصرہ:

اصولِ فقہ کی تمام کتب میں یہ بحث موجود ہے کہ فقہ کے اصول چار ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماعِ امت، قیاسِ صحیح۔ اس پر مدلل مکمل بحث قرآن و حدیث کی روشنی میں کتب اصول میں موجود ہے۔ اب قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ اجماعِ امت اور قیاس کا درجہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی ہے۔ یعنی جس مسئلہ کا ذکر قرآن پاک و حدیث شریف میں صراحتاً نہ ملے تو پھر اجماع یا قیاسِ صحیح پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جدید اور نو وارد مسائل اور زمانۂ نبوت سے بعد میں پیدا ہونے والے مسائل جو کہ بدعات سے بھی موسوم ہو سکتے ہیں، ان کے جواز یا عدم جواز پر اجماع امت یا قیاس کی ضرورت ہو گی۔ اگر اجماعِ امت یا قیاس اس کو جائز قرار دے دیوے تو وہ اگر چہ نو پید اور بدعت ہو گی تو فقہ میں جائز ہی قرار دیے جائیں گے۔ اب ہم اس نتیجے پر بآسانی پہنچ سکیں گے کہ اصولِ فقہ کے اعتبار سے بھی بعض بدعات جائز ہو سکتی ہیں۔ دلیل کے لیے حدیث شریف پر توجہ ہو۔

مؤطا امام محمد، ص۱۱۲: مارأه المؤمنون حسنا فهو عند اللّٰه حسن. یعنی جس مسئلہ میں مسلمانوں کی رائے یہ ہو کہ یہ حسن ہے تو وہ یقیناً اللہ کے نزدیک بھی حسن ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رائے کا مقام کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بعد ہے۔ جدید ایجاد شدہ نو وارد مسائل میں اہلِ اسلام کامل مومنین کی رائے معتبر ہے۔ جس بدعت پر اہلِ اسلام کی رائے حسن ہو وہ

بدعتِ حسنہ ہوگی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آیت کریمہ: إِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَ إِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ کو خطبہ میں شامل فرمایا۔ شارح مشکوٰۃ صاحب مرقاۃ ج ۳، ص ۲۵۴ پر رقم طراز ہیں کہ یہ بدعت حسنہ ہے بلکہ سنت مستحسنہ ہے۔ جیسا کہ بروایت صحابی رسول حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ مروی ہے: مارآہُ المُسْلِمُوْنَ حَسَناً فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ حسنٌ.

مؤطا امام محمد، ص ۱۱۲: ماراۃ المؤمنون حسناً فھو عند اللّٰہ حسن

ابوداؤد شریف، ج ۲، ص ۱۴۹: عن اناس من اھل حمص من اصحاب معاذ بن جبل ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لما اراد ان یَبْعَثَ مَعَاذاً اِلَی الْیَمَنِ قَالَ: كَیْفَ تَقْضِیْ اِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَاء قَالَ: اَقْضِیْ بِكِتَابِ اللّٰہِ قَالَ: فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فِیْ كِتَابِ اللّٰہِ قَالَ: فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰہِ قَالَ: فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فِیْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم وَلَا فِیْ كِتَابِ اللّٰہِ قَالَ: اِجْتَھِدُ بِرَائِی وَلَا آلُو فَضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم صَدْرَہٗ فَقَالَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رسول اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لِمَا یَرْضٰی رَسُوْلُ اللّٰہ. یعنی حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ کو یمن کی جانب روانہ فرماتے وقت حضرت معاذ سے پوچھا کہ جب تمھارے پاس کوئی فیصلہ آئے تو کس طرح فیصلہ کرے گا؟ حضرت معاذ نے عرض کیا کہ: قرآن مجید سے فیصلہ کروں گا۔ پھر سرکار نے فرمایا: اگر قرآن پاک میں اس کے بارے میں فیصلہ نہ ملے؟ عرض کیا کہ: حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ سرکار نے فرمایا: اگر حدیث شریف میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا: اجتھد برائی یعنی اپنی رائے سے اجتہاد کرکے فیصلہ کروں گا۔ تو نبی علیہ السلام نے حضرت معاذ کے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: حمد ہے اس ذات پاک کے لیے جس نے اپنے رسول کے قاصد کو ایسے راہ کی توفیق بخشی جس پر رسول اللہ راضی ہیں۔

نتیجہ ملا کہ نو وارد مسائل جو کہ قرآن و حدیث میں صراحتاً نہ سمجھے جاویں ایسے مبتدعہ (جدید) مسائل پر اہل ایمان کی رائے معتبر ہے۔ اگر اس نو وارد کو جائز قرار دیں یا ناجائز۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہیں۔ تو پھر اگر جائز قرار دیں گے تو وہ نو وارد اور مبتدعہ مسئلہ جس کا وجود صراحتاً قرآن و حدیث میں نہ پایا گیا ہو وہ جائز ہی ہوگا۔

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، ج ۳، ص ۲۶۴: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ سے پہلے اعلام کا حکم فرمایا تھا۔ پھر انھوں نے فرمایا: نحن ابتدعنا ذلک لکثرۃ المسلمین یعنی ہم نے اس بدعت کو قائم کیا، کیونکہ ضرورت کثرتِ مسلمین در پیش تھی۔

بخاری شریف، ج ۱، ص ۱۲۵: عن السائب بن یزید یقول: ان الاذان یوم الجمعة کان اوّلہ حین یجلس الامام یوم الجمعة علی المنبر فی عھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و ابی بکر و عمر فلمّا کان فی خلافة عثمان و کثروا امر عثمان یوم الجمعة بالاذان الثالث اذن بہ علی الزوراء فثبت الامر علی ذٰلک یعنی حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جبکہ امام جمعہ خطبہ کے لیے بیٹھتا تھا۔ حضور نبی پاک کے زمانہ اور حضرت صدیق و عمر کے زمانہ میں بھی اسی طرح معمول رہا، مگر حضرت عثمان کے دور خلافت میں مسلمان زیادہ ہوگئے تو حضرت عثمان نے جمعہ کے دن حکم فرمایا تو تیسری اذان (جس کا وجود سب سے اوّل ہے) مقام زوراپر دی گئی تو اس پر معمول رہ گیا۔

صاحب مرقاۃ، ج ۳، ص ۲۶۳ پر رقم طراز ہیں: ابن حجر نے کہا کہ یہ اوّل بدعت ہے۔ حضرت ابن عمر نے اس اذان کا نام بدعت رکھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ نبی پاک کے زمانہ کے بعد جو کام جدید ہو وہ بدعت ہے (یہ بدعت حسنہ تھی) اور فرماتے ہیں کہ: حضرت عثمان نے اس کام کی بدعت کی۔ پھر صحابہ کا خاموش رہنا (اس بدعت پر انکار نہ کرنا) یہ صحابۂ کرام کا سکوتی اجماع تھا۔ یعنی صحابۂ کرام نے جب انکار نہ کیا تو گویا کہ اس بدعت کے جواز پر متفق ہوگئے، تو اجماعِ صحابہ سے ہی اس بدعت کا جواز ثابت ہوا۔

بخاری شریف، ج ۱، ص ۲۳۸: عن مجاھد قال دخلت انا و عروۃ بن زبیر المسجد فاذا عبداللّٰہ بن عمر جالس الی حجرة عائشة و اذا اناس یصلون فی المجسد صلوٰۃ الضحیٰ قال: فسألناہ عن صلوتھم فقال بدعة. یعنی حضرت مجاہد (تابعی رسول) فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عروہ بن زبیر آئے تو حضرت عبداللہ ابن عمر حضرت عائشہ کے حجرہ کی جانب تشریف فرما تھے اور ادھر مسجد نبوی شریف میں کافی لوگ نمازِ ضحیٰ پڑھ رہے تھے۔ ہم نے ان کی نماز کی بابت دریافت کیا تو حضرت عبداللہ ابن عمر نے فرمایا: یہ بدعت ہے۔

ظاہر ہے کہ صلوٰۃ ضحیٰ تو بدعت نہ تھی، البتہ مسجد شریف میں اجتماعی ہیئت سے صلوٰۃ ضحیٰ کے بارے میں بدعت فرمایا ہو، تاہم حضرت عبداللہ ابن عمر کا بدعت فرما کر ان کو نہ روکنا اور پھر اجتماعِ صحابۂ کرام کا اس بدعت پر عمل پیرا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بدعت حسنہ تھی، جس پر اجتماعِ صحابہ عمل پیرا تھے۔ ان کا یہ عملی اقدام اور سنت فعلی بدعت حسنہ پر عمل کرنے کے لیے اجماعِ صحابہ ہے۔

ایک عظیم مغالطہ:

بعض حضرات کو یہ مغالطہ پیش آیا کہ بدعت وہ جدید کام ہے جو نبی علیہ السلام، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے بعد پیدا ہو، وہ ضلالت یعنی گمراہی ہے۔ اس مغالطہ پر نشاندہی لازم ہے:

۱۔ جو لوگ بدعت کا تعارف اس قدر طویل اصول سے پیش کرتے ہیں اس پر کوئی دلیل قرآن وحدیث سے کہیں نہیں ہے۔ یہ ان کی ذاتی رائے ہے بلکہ اس رائے کا وجود نبی علیہ السلام اور صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے بعد ایجاد ہوا ہے اور یہ رائے خود بدعت ہے۔

۲۔ اگر فی الواقع بدعت کی تعریف یہی ہے تو پھر تراویح باجماعت کو حضرت عمر بدعت نہ فرماتے اور یوم جمعہ اذان اوّل کا نام صحابی رسول ابن عمر بدعت نہ رکھتے اور صلوٰۃ ضحیٰ مسجد شریف میں ہیئت اجتماعی کے ساتھ ادا کرنے کو بدعت نہ فرماتے، کیونکہ یہ سب کام تو صحابہ کرام کے زمانہ میں ہی ہو رہے تھے، مگر ان کو جب صحابۂ کرام نے ہی بدعت فرمایا تو معلوم ہوا کہ بدعت کی تعریف کرنے میں خود بعض حضرات کو مغالطہ پیش آیا ہے اور پھر قرآن مجید جمع کرنے کے سلسلے میں خلفیۃ المؤمنین حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان بحث اور پھر تسویہ کی صورت پیدا ہونے کا سوال ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ شریعت کے بارے میں تو یہ حضرات عارف اور عالم تھے، تو انھوں نے یہ کیوں نہ سمجھا کہ جب یہ کام صحابۂ کرام کے دور میں ہو رہا ہے تو بدعت کیسے ہے اور پھر شیخین کی اس بحث میں یہ جواب کسی نے نہ دیا کہ یہ بدعت نہیں ہے بلکہ جدید کام مان کر یوں فرمایا گیا وَاللّٰہ خَیْرٌ یعنی اللہ کی قسم! یہ بدعت حسنہ ہے۔

۳۔ بدعت کی حرمت تو اس حدیث سے ہے: کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃ یعنی ہر بدعت گمراہی ہے۔ ان کے زعم اور دلیل میں جب یہ ہے کہ تمام بدعات گمراہی ہیں اور پھر صحابۂ کرام اور تابعین کے زمانہ میں پیدا ہونے والی بدعات کو ضلالت نہ سمجھ کر حکم عام میں تخصیص کے قائل تو خود ہی ہو گئے اور دلیل عموم کو خود رد کر دیا۔ جس دلیل کو انھوں نے ہی رد کر دیا تو پھر مخالف کے مقابل اس کو دلیل کیسے بنانے کے حقدار ہیں۔ عمومی اعتبار سے جب یہ حدیث ان کی اپنی تحقیق خود ساختہ سے دلیل نہ رہی تو پھر بدعت حسنہ کی حرمت کس دلیل سے ثابت کریں گے، کیونکہ جب تخصیص کا دروازہ کھل گیا اگر صحابۂ کرام کے زمانہ میں پیدا ہونے والی بدعات کی تخصیص حدیثِ پاک کے حکم عام کے مخالف نہیں ہے تو بدعتِ حسنہ کے لیے اس کی تخصیص اس حدیث شریف کے مخالف کیسے ہوگی؟

حدیث بدعت میں متعدد روایات:

حدیث شریف کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃ کی تفسیر میں جامع مانع انداز سے مدلل مضمون پیش کرنے کے باوجود بھی اگر شکوک وشبہات کی گنجائش باقی ہو تو واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو حدیث بدعت کے بارے میں مروی ہے اس میں الفاظ کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃ ہیں، مگر اس موضوع پر حضرت بلال بن حارث سے جو حدیث مروی ہے اس میں لفظ 'کل' جس میں استغراق یا حصر ہو موجود ہی نہیں بلکہ فقط 'بدعۃ سیئۃ' ہی کا ذکر ہے۔ (مشکوٰۃ شریف، ص ۳۰)

ومن ابتدع بدعۃ ضلالۃ لا یرضاہ اللّٰہ ورسولہ کان علیہ من الاثم مثل اثام من عمل بھا. الی آخرہ یعنی جس نے بدعت سیئہ کی بنیاد قائم کی جس پر اللہ اور اس کے رسول راضی نہ ہوں اس پر اس کا گناہ بدعتِ سیئہ پر عمل کرنے والوں کے گناہ کے مثل ہوگا۔ اس حدیث شریف میں تو 'کل بدعۃ' کا ذکر ہی نہیں ہے، فقط 'بدعۃ سیئۃ' کا ہی ذکر ہے۔ تو یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے لیے مخصص اور مفسر ہو سکتی ہے۔ 'کل بدعۃ' کی تعبیر زبانِ رسالت پناہ سے خود واضح ہوگئی۔ اگر اس حدیث میں بدعت سیئہ کا ذکر ہے تو پہلی حدیث میں ہی فقط بدعت سیئہ مراد رسول مقبول ہے۔ اس کے خلاف جو مدعی مفہوم حدیث سادہ دل مسلمانوں کو سمجھانا چاہتا ہے یہ معنی مرادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے جو اس کی ذاتی مراد ہے۔ اس لیے منکر کا معنی بے بنیاد ہے۔ اس حدیث کی تفسیر میں ملا علی قاری شرح مشکوٰۃ ج ۱، ص ۲۴۶ پر رقم طراز ہیں: **وقید بالضلالۃ لاخراج البدعۃ الحسنۃ** یعنی نبی علیہ السلام نے بدعت کو لفظ ضلالت سے موصوف فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ بدعتِ حسنہ اس حکم سے مستثنیٰ اور خارج ہے۔ بدعتِ حسنہ کی بنیاد قائم کرنے والا مجرم نہیں بلکہ ثواب کا حقدار ہے۔ اب تو واضح طور پر حدیث رسول اللہ سے 'کل بدعۃ' کا مفہوم روشن ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

عابدین مؤمنین کا عمل بدعتِ حسنہ کے لیے کسوٹی ہے:

دارقطنی، ج ۱، ص ۴۷: **ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم سُئِل عن الامر یحدث لیس فی کتاب ولا سنۃ فقال: ینظر فیہ العابدون من المؤمنین** یعنی نبی علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ نو پیدا مبتدعہ کام جس کا وجود قرآن وحدیث شریف میں صراحتاً نہ ہو تو ایسے مبتدعہ نو پیدا کام کو کرنا چاہیے یا نہیں؟ نبی علیہ السلام نے فرمایا: امت کے اہلِ ایمان عابد لوگوں کو دیکھا جائے گا یعنی اگر نیک مومن اس کام کو کریں تو تم بھی کرنا اگر وہ نہ کریں تو تم بھی نہ کرنا۔ سبحان اللہ! بدعت کے بارے میں کیا ہی پرکھ کا طریقہ ارشاد فرمایا۔ گویا کہ ایک کسوٹی کی رہبری فرمائی یعنی عمل مؤمنین عابدین اس بات کے جواز وعدم جواز کے لیے کسوٹی ہے۔ □□